سلسلہ تصنیفات مسلم بک سوسائٹی نمبر ۷

لا الٰہ الا اللہ

توحید فی الاسلام

اور اُس کا اثر

تمدن۔ تہذیب۔ اخلاق۔ معاشرت اور ایمانیات پر

مُصنفہ

خواجہ کمال الدین صاحب مبلغ اسلام و امام مسجد ووکنگ (انگلستان)

اگست سنہ ۱۹۲۱ء

میں

مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل لاہور نے شائع کی

اوّل — کریمی پریس لاہور میں منشی امیر بخش کے اہتمام سے چھپی — تعداد دو ہزار

فہرست مضامین توحید فی الاسلام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

آ! رُوحِ توحید پھر آ! اور اُس قوم کو دوبارہ زندہ کر۔ جو تجھ سے نا آشنا ہے۔ مگر دُنیا میں آج وہی ایک ہے جو تیری کشش کی نام نہاد ناخدا ہے۔ تو ہی مذہب کی رُوح اور تُو ہی تمدّن و تہذیب کی جان ہے۔ تیری ہی پرستش میں اخلاق فاضلہ کی آبیاری اور تیرے ہی چھوڑنے سے ظلمت وجہالت کی گرم بازاری ہے تو ہی علوم جدیدہ کی محرک اور تو ہی حکمت و فضیلت کی مُولّد ہے۔ تیری ہی حقیقت پر قائم ہونے سے اِنسان اِنسان ہے۔ تجھ سے ناآشنا ہونے سے وہ دُوسروں کی باربرداری کے لئے کالانعام بلکہ ازخود

حیوان ہے۔ تو ہی جان جمہوریت اور تجھ سے ہی حقوق انسان کی حفاظت ہے تجھ سے ہی حریت کا سر اونچا اور تجھ سے ہی استبداد کا سر نیچا ہو سکتا ہے۔ تو نے ہی انسان کو کل مخلوقات پر حکمران بنایا تو نے ہی اُسے ملکوت السمٰوات والارض کا مسجود ٹھہرایا۔ علم و حکمت تیری ہی رہین منت دُنیوی دولت و ثروت۔ حکومت شوکت۔ الغرض سب کچھ تیری ہی خیر و برکت ہے۔ تیرے آنے سے ہی ہم نے سب کچھ پایا اور تیرے جانے سے ہی ہر خوبی کو گنوایا۔

نسل انسانی کو کمال تک پہنچانے کے لئے خدا کے نزدیک توحید پر ایمان لانا کچھ اِس قدر ضروری نظر آتا ہے کہ صفی اللہ سے لیکر ختمیت مآب علیہ الصلوٰۃ والسّلام تک احدیت مآب کی طرف سے جو نبی ہو کر آیا وہ یہی ایک پیغام توحید لایا۔ لیکن آدم کے بیٹے اِس معاملہ میں کچھ ایسے کودن واقع ہوئے کہ اُنھوں نے اِس مسئلہ کو کبھی نہ سمجھا بمشکل اُنھوں نے اپنے لئے اپنے ہاتھ سے اپنی دوسری

استعمالی چیزوں کی طرح ایک نہ ایک معبود نہ بنالیا اُنہیں چین نہ پڑا۔ اُس مصور یا شاعر کی طرح جو اپنے تخیل میں ایک چیز کو خوبصورت بنا کر اُسے کاغذ پر لے آتا ہے۔ پھر آپ ہی اپنی بنائی ہوئی مخلوق کا پرستار ہو جاتا ہے۔ اپنی ہی طبعزاد پر وہ منشاء اور اپنے ہی دماغ سے نکلی ہوئی چیز پر قربان ہوتا ہے، انسان وقتاً فوقتاً اپنا خدا آپ بناتا رہا جس کی شکل وصورت اور خط وخال اُس کی وقتی ضروریات اور اُس کا ماحول تجویز کرتا رہا۔

بظاہر تو یہ معمہ نظر آتا ہے کہ کیوں ایک ذی عقل انسان اپنی مخلوق کو اپنا خالق اور اپنے ہی مملوک کو اپنا مالک سمجھ لیتا ہے۔ لیکن یہ بات ایسی نہیں کہ جسے فطرت انسانی کے کرشمے دیکھنے والا سمجھ نہ جائے کیا انسان اپنے جذبات کا غلام اور اپنی ضروریات کا پرستار نہیں ہے جب دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو عقیدتاً پابند توحید ہو کر اپنے جذبات اور اپنی ضروریات کو اپنا خدا بنالیں تو اُن وجودوں کا اِن کے خدا ہو جانا کونسا

امر مشکل ہے جو اُن کے خیال میں اُن خواہشات و ضروریات کے دفعیہ کے متکفل ہو سکتے ہیں۔ آج الہیات میں گو زمانہ اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ بتوں کے آگے جھکنے والا اور ایک عاجز انسان کو خدا بنانے والا بھی توحید کی لے الاپتا ہے اور اپنے اس مشرکانہ افعال کو فلسفیت کا جامہ پہنا کر اس فعل کو ایک ضرورت حقہ قرار دیتا ہے۔ لیکن اس زمانہ نے سابقہ معبودان باطلہ کے علاوہ اور طرح کے خدا بھی پیدا کر رکھے ہیں جس انسان یا جس دنیوی ہستی کے ساتھ ہماری کوئی ضرورت وابستہ ہو وہ ہمارا خدا بن جاتا ہے ہم اُسکے آگے سجدہ و رکوع تو نہیں کرتے۔ اور نہ اُن فقرات کو اُسکے آگے دہراتے ہیں۔ جو ہم نے اپنی عبادات میں خدا کے لئے خاص کر رکھے ہیں لیکن یہ شعار عبادت تو فی نفسہٖ کوئی چیز نہیں۔ یہ تو اُس روح اطاعت وانقیاد کا مظاہرہ ہے جو انسان میں معبود حقیقی کے متعلق ہونا چاہئے۔ مثلاً ایک ہندو مورتی کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک عیسائی یا یہودی اپنے معبد میں زانو ٹیک

لیتا ہے اسی طرح ہر مذہب وملت والا عبادت کے وقت کوئی نہ کوئی عجز وانکسار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ تذلل کی مختلف شکلیں بذاتہ تو کوئی چیز نہیں یہ تو اظہار عبودیت ہے اس کے ذریعہ ہمیں یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ ہم اپنے ہر ایک معاملہ میں صرف اس ذات کی حکومت کے تلے ہیں جسکے سامنے ہم بوقت عبادت جھک جاتے ہیں اور اگر اس ذات کی منشاء میں اور کسی اور ذات کی منشاء میں تضاد واقع ہو تو ہم اُسی ذات کی منشا پوری کریں گے کہ جس کی مورتی کے آگے ہم ہاتھ باندھتے ہیں۔ یا جس کی عبادت میں ہم کوئی صورت تذلل اختیار کرتے ہیں۔ اب اگر کسی ضرورت واحتیاج کے وقت ایک انسان حقیقی معبود کو چھوڑ کر کسی مفروضہ قاضی الحاجات کی طرف جھک جائے اور ایسے وقت پر وہ منشاء خداوندی کے خلاف اُس کی منشاء پوری کرے تو اُس نے فی الواقع وہی بُت پرستی کی جس میں دنیا ایام جہالت سے گرفتار رہی وہ لاکھ موحد بنے اور لاکھ بُت پرستی کو بُرا بھلا کہے لیکن وہ تو خطرناک بُت پرست

ہے۔ بلکہ یہ بُت پرستی قدیمی بُت پرستیوں سے بدرجہا ذلیل اور اُس کے ہم نوع کے لئے خطرناک طور پر نقصان دہ ثابت ہوتی ہے *

میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ خدا کے متعلق صحیح علم نہ ہونے پر بھی ہوا و ہوس اور جذبات ہمارے خدا ہو جاتے ہیں۔ ہماری ضروریات جو جذبات و ہوا سے پیدا ہوتی ہیں ہماری گردن ہر جگہ جُھکاتی ہیں۔ جب اسباب دفع ضرورت پر ہم خود قادر نہیں ہوتے تو ہم طبعًا کسی اور طرف دیکھتے ہیں وہی آہستہ آہستہ ہمارے خدا ہو جاتے ہیں۔ ہندی اور یونانی فسانجات ملیہ اس حقیقت پر خوب روشنی ڈالتے ہیں دونو جگہ مختلف ضروریات و جذبات کے حسب حال دیوی دیوتا نظر آتے ہیں۔ مال و دولت اولاد۔ فصلات۔ پانی۔ ہوا۔ ان سب باتوں کے حصول کے لئے وہاں مختلف دیوی دیوتاؤں کو پکارا جاتا ہے۔ ایسا ہی مختلف تکالیف کا دفعیہ بھی مختلف معبود ذاتوں سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ پھر اِس سے بڑھکر مختلف جذبات اور اخلاق انسانی بھی

جامہ الوہیت پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اسی طرح دوسرے انسانی قوی مختلف شکتیوں کی شکل میں خدا بنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ذرا بنظر تعمق ان باتوں کو دیکھا جائے تو سارے کے سارے وہی انسان کے ہوا و ہوس ہیں۔ قرآن نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے افرء یت من اتخذ الٰھہ ھوٰہ (سورہ۔ ۴۵۔ آیت ۲۳) کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنی ہوا کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

عربی زبان میں "ہوی" کے معنے صرف حرص یا لالچ نہیں۔ بلکہ "ہوا" کے معنے کل جذبات بہیمیہ و شہوات انسانی ہیں مثلاً بھوک۔ پیاس۔ غصہ۔ لالچ ان سب پر لفظ "ہوا" عائد ہوتا ہے۔ دراصل یہی وہ چیزیں ہیں جو مختلف ضروریات پیدا کر کے ہماری قوتوں کو حرکت میں لاتی ہیں اور جب ان کے دفعیہ میں ہم اپنی طاقت کو ناکافی پاتے ہیں تو ہم دوسروں کی طرف جھکتے ہیں۔ ایسے حالات پر بعض وقت ہم انہیں اپنا مسجود بنا لیتے ہیں جو کسی طرح بھی ہمارے معبود نہیں ہونے چاہئیں۔ اسی نے

مختلف اوقات میں طرح طرح کی شرک پرستیاں پیدا کیں آج اگر ہم نے پرانی قسم کی بت پرستی کو ایک فعل ذلیل سمجھ کر چھوڑ دیا ہے تو کیا ہوا وہ ضروریات ہمیں اب تک لاحق ہیں جن کے سبب ہم نے نئی قسم کی بت پرستی اختیار کر لی ہے۔ پتھروں اور مورتیوں کی جگہ شکل انسانی میں بہت سے معبود آج پیدا ہو گئے ہیں طلب دولت میں ہم لچھمی کی جگہ اب لچھمن کے آگے جھک جاتے ہیں جو ہمارے خیال میں ہمیں دولت مند بنا سکتا ہے۔

یہ جدید بت پرستی پہلی بت پرستی سے زیادہ تر نقصان دہ ہے۔ پرانے بتوں کو خوش کرنے کا ہم طریق جانتے ہیں۔ ان کی رضامندی کے لئے کچھ پیسے کچھ پھول کچھ بھوگ کافی ہے بعض وقت کچھ ریاضتیں بھی مقرر ہیں جو ہم کر سکتے ہیں۔ کچھ اخلاقی مطالبات بھی ہوتے ہیں جو ہم پورا کرتے ہیں یعنی یہ معبود ہم سے امید رکھتے ہیں کہ ہم ان کی جناب میں حاضر ہونے سے پہلے بعض ستودہ اخلاق سے متصف ہوں۔ مثلاً جناب مسیح کو مخاطب کرنے سے پہلے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے حالات کو ان کی تعلیم

کے مطابق کریں اس قسم کے شرک کا نقصان زیادہ تر ان معبودوں کے پرستار کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ وہ اُن ہستیوں کو معبود بنا کر اکتساب کمال سے رہ جاتا ہے۔ لیکن یہ بت پرستی کسی اور کی ذات کے نقصان کا موجب بہت ہی کم ہوتی ہے۔ جن شرائط کے پورا ہونے پر ہمارے پُرانے بت یا معبود ہماری ضروریات پورا کر دیتے تھے وہ ہمیں معلوم نہیں۔ اُن میں کوئی اور نقصان نہ تھا۔ علاوہ ازیں ان سب معبودوں کی پیدائش ازمنہ سابق میں ہوئی تھی۔ جن باتوں سے وہ خوش ہوتے ہیں وہ کتابوں میں آچکی ہیں۔ ان مطالبات پر وہ کچھ اور ازدیاد نہیں کر سکتے۔ اس لئے یہ بت پرستی پرستار کے ذاتی نقصان کے سوا اور کسی نقصان کی موجب نہیں۔ آج ہم پر گو قدیمی معبودوں کا بے حقیقت ہونا ثابت ہو گیا مگر اس ساری بت پرستی کی جڑ تو وہی ہوا و ہوس تھی جس کا پورا ہونا ہم اِن کی ذات سے وابستہ کرتے تھے وہ تو ہم میں موجود ہے ہمارے ساتھ احتیاجیں لگی ہوئی ہیں۔ اس لئے اُن کے دفعیہ میں قدیمی بتوں کی بجائے آج جن بتوں کو

شکل انسانی میں ہم نے قاضی الحاجات سمجھ لیا ہے۔ وہ نسل انسانی اور مفاد قومی کے لئے زیادہ خطرناک اور مضر ہیں آجکل کے بُت بولتے ہیں۔ ان باتوں کی خواہشات ہیں کہ جن کی کوئی حد بندی ہی نہیں۔ یہ بھوگ اور پھول نہیں چاہتے بلکہ اپنے خاص اغراض کو ہم سے پورا کرانا چاہتے ہیں۔ دنیا میں کون انسان ہے جس کے مفاد کسی اور انسان کے مفاد کے خلاف نہیں جاتے۔ اب جو اوّل الذکر انسان کا پرستار ہوگا وہ لازماً اپنے معبود کی خوشی کے لئے آخر الذکر کو نقصان پہنچائیگا۔ آج یہ دوسری قسم کی بت پرستی کل دنیا میں مشرق یا مغرب میں آزاد سے آزاد ممالک اور قوموں میں پورے غلبہ کے ساتھ انسانی قلب پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ اور خصوصاً وہ قوم جو توحید کی مدعی ہے وہ کثرت سے اس شرک عظیم میں مبتلا ہے۔ اس قوم کے بعض افراد گرفتار ہوا و ہوس ہو کر کسی بولنے والے بُت کے آگے جُھک جاتے ہیں۔ اسلام نے اُنہیں مورتی پوجا سے تو بچایا یا مرے ہوئے انسانوں کی پرستش کو اُن کی نگاہ میں حقیر

ٹھہرایا لیکن وہ اس شان توحید کے ساتھ زندہ بتوں کے آگے جھک گئے جن کی خواہشات کا پورا ہونا بعض وقت دوسروں کے مفاد کو نقصان دے سکتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ طلب روزگار میں ایک شخص لچھمی کو پوجتا۔ کسی قبر پر پھول چڑھاتا کسی بزرگ کی نذر نیاز دیتا اس سے اس کے چند پیسوں کا نقصان تھا لیکن دوسروں کا بھلا تھا۔ مجاوروں یا پوجاریوں کو چار پیسے مل جاتے تھے۔ کسی مفلس محتاج کے منہ میں کچھ لقمے پڑ جاتے تھے۔ آج ہم ان باتوں کو کسر شان توحید سمجھتے ہیں۔ لیکن طلب روزگار میں روزگار بہم پہنچانے والے کی خواہش کو پورا کرنا حکم خداوندی سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ انسان ظالم طبع ہو یا وہ اپنا مفاد دوسروں کی تباہی میں یا تضعیف میں دیکھتا ہو۔ ہم مدعیان توحید اس کے ظلم وستم کا ایک آلہ بن جاتے ہیں۔ جہانتک شرک کا سوال ہے وہ تو اسی دم پیدا ہو جاتا ہے جب انسان ہوا و ہوس کا غلام ہو کر کسی غیر اللہ کے آگے اپنی احتیاج لے جاتا ہے خواہ اُس کا مخاطب ایک پتھر کی مورت ہو۔ یا ایک انسان ہو۔ حقیقت توحید

صرف یہ نہیں کہ ہم ان شعار عبادت کو جو خدا کے لئے ہم نے خاص کر رکھی ہیں کسی اور کے متعلق نہ کریں بلکہ ان تمام شعار کا مقصد جیسے میں نے اوپر بیان کیا صرف اظہار اطاعت ہے ہم کسی انسان کو لاکھ دفعہ مسجود نہ بنائیں اُسے اس طرح مخاطب نہ کریں جس طرح خدا کو مخاطب کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس کی اطاعت میں ہم نے خدا کے کسی حکم کو توڑا تو ہم نے بیشک اُسے سجدہ کیا سجدہ کے معنے ہی اطاعت ہے۔ منشا سجدہ چھوڑ خود نماز از روئے قرآن صرف روحِ اطاعت کے لئے تجویز ہوئی۔ حافظوا علی الصّلوٰۃ وَالصّلوٰۃ الوسطیٰ وقوموا للہِ قانتین۔ حفاظت نماز کرو اور بہترین نماز ادا کرو اور وہ یہ ہے کہ خدا کی اطاعت میں کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ قرآن نے بے جان چیزوں کے سجدہ سے مراد اطاعت لی ہے +

آج ہم شعار نماز پر جنگ کرتے ہیں آج ناف یا زیر ناف پہ ہاتھ باندھنے یا رفع یدین کے تنازعے ہم میں مختلف قسم کے فسادات کرا دیتے ہیں۔ لیکن ان شعار کی جو اصلی غرض تھی ہمکو

ہر وقت ہم توڑ رہے ہیں +

ایک شخص وضو کر کے دنیا سے ہاتھ دھوتا ہے۔ اپنے ہر ایک عضو کو اُس کی آغشتگی سے پاک کر لیتا ہے۔ مُد نیوی خداؤں سے کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے اور اللہ اکبر کر کے سب سے پہلے ظاہر کرنے کے لئے کہ وہی اسکا محبوب ہے۔ آیت اشدُّ حبًّا للہ کی حقیقت اپنے پیرو ارد کرتا ہوا زبان حال سے اس حقیقت کے اظہار میں اپنے ہاتھ سینہ پر باندھتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ انداز ہے جو اظہار محبّت میں کیا جاتا ہے۔ کامل محبت کامل اطاعت کو چاہتی ہے۔ اطاعت ہی اظہار محبّت کا بہترین طریق ہے۔ اِس لئے وہ ہاتھ جو اظہارِ محبت میں سینہ پر گئے تھے اب وہ اطاعت میں زیر ناف آجاتے ہیں کیونکہ تصویری زبان میں اطاعت کا اظہار زیر ناف ہاتھ باندھنا ہر جگہ ہر قوم میں ہوا ہے۔ محبّت۔ استغراق اور محویت کو بھی چاہتی ہے اس حالت میں نہ ہاتھ ناف کے اوپر نہ نیچے رہ سکتے ہیں بلکہ ہاتھ کھل ہی جائینگے۔ جو بیکسی کی ایک سچی تصویر ہے۔ ان ہاتھوں

کا کھلنا مختلف کیفیات قلبی کے ماتحت اِن مختلف شکلوں کو
اختیار کر لیتا ہے جن سے آج ایک حنبلی۔ مالکی یا شیعہ بھائی
اپنی نماز میں متمیز ہو جاتا ہے۔ مگر یہ حالت قیام تو ایک قسم کی حالت
انتظار ہے گویا ایک عاشق اپنے معشوق یا ایک نوکر اپنے آقا
کے مُنہ کو دیکھ رہا ہے کہ کیا حکم ہوتا ہے۔ کلّی اطاعت تو اسی
میں ہے کہ کسی امر کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ ہم اپنے آقا پر ظاہر کریں
کہ ہم اُس کے ہر حکم کے سامنے جُھکنے کو تیار ہیں اس کیفیت قلب
کے اظہار میں ہم رکوع میں چلے جاتے ہیں لیکن اس انداز
میں بھی ابھی کسر باقی ہے۔ مطاع کے مقابل ہم اپنی ایک
حیثیت یعنی حیثیت مطیع کو قائم کر رہے ہیں۔ ہم نے تو یہ ظاہر
کرنا ہے کہ ہم اپنی ذات رائے اور ہستی اِن سب کو اس کے
لئے گنوا سکتے ہیں اور ایک بے جان کی طرح اس کے ہاتھ
تلے رہ سکتے ہیں۔ اسی امر کا اظہار سجدہ کی شکل اختیار کر لیتا
ہے۔ کمال توحید اِسی میں ہے کہ انسان اُس معرفت تامہ پر پہنچ جائے
کہ اس کی اپنی ہستی خدا کے سامنے لاشئے ہے۔ چنانچہ ان سب

شعارِ نماز کی حقیقت صرف اظہارِ توحید کامل ہے۔ یعنی ہمارا مطاع ہمارا حاکم صرف ایک ذات باری ہے۔ شریعت۔ طریقت۔ حقیقت۔ معرفت سب نماز میں آجاتے ہیں۔ شریعت اگر دنیا میں اس لئے آئی کہ ہم پر اپنا لاشے ہونا متحقق کرکے ہمیں حقیقی متبوع کے ہاتھ میں ایک مُردہ کی طرح ڈالدے تو اس شریعت کو عمل کا جامہ طریقت پہنانے کی طرف ہمارا نماز میں قیام کرنا اشارہ کرتا ہے۔ اگر رکوع میں جاکر ہم اپنے پر یہ حقیقت وارد کرلیتے ہیں کہ ہم اپنے متبوع کے مقابل کوئی اپنی رائے نہیں رکھتے تو ہم سجدہ میں گر کر اس معرفت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہماری کوئی حقیقت و حیثیت نہیں جو کچھ ہے وہی ہے۔

اب میں مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ کہیں تم مشرک تو نہیں ہوگئے۔ مانا کہ تم بتوں کے آگے نہیں جھکتے۔ لیکن خدارا دلوں کا احتساب کرو۔ اپنی نیّات و معاملات پر غور کرو۔ تمہیں ان نمازوں کے ذریعہ پانچوں وقت ایک نہایت ہی کڑی توحید کا سبق دیا جاتا ہے۔ دن میں کم از کم بتیس ۳۲ سجدہ کرکے تم خدا کی

جناب ہیں اقرار کرتے ہو کہ ہم کیا اور ہمارے ارادے اور ہماری طاقت کیا؟ ہم تو بیجان مُردہ کی طرح تیرے ہاتھ پڑے ہوئے ہیں۔ جس طرح چاہو ہمیں استعمال کرو۔ کیا تم جیسے ہی موحد دنیا میں ہوتے ہیں۔ جو ہر قدم پر ہی دنیوی لالچ میں آکر کسی انسان کی منشاؤں کے آگے سجدہ کرتے کرتے صدہا قومی مفاد اور ملی اغراض تباہ کرتے ہیں۔ اپنے بھائیوں کے گلے کاٹتے ہیں۔ اب اگر یہ باتیں قرآن کی کسی کھُلی تعلیم کے خلاف ہیں تو تم نے ایک بوتے بُت کو اپنا مسجود بنا رکھا ہے۔ تمہارا سینہ پر ہاتھ دھرنا تمہارا قیام قعود۔ رکوع۔ سجود حقیقی طور پر غیر اللہ کے لئے ہے ✦

ہم ہیں کے وہ لوگ جنہیں توحید کا خاص شغف ہے۔ وہ کسی قبر پرست یا گیارھویں منانے والے سے اتنا نہ بگڑا کریں۔ وہ اپنے ہی گھر کا جائزہ آپ لے لیں کہیں اُن کے ہی کیمپ میں ہزاروں زندہ قبروں کے پوجنے والے تو نہیں کیونکہ جن میں رُوح نہیں وہ انسان ہی قبر ہے۔ وہ اپنی توجہ اب مسلمانوں کی اُن چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہٹا لیں جنہیں آج سے بیس پچیس سال

پہلے شرک پکار کر اُنہوں نے بعض وقت نفع کے مقابل نقصان زیادہ
کیا۔ یہ باتیں خود بخود مٹتی جاتی ہیں۔ وہ اپنے امتیاز توحید کو
تو آج بھی قائم رکھیں۔ لیکن شرک فی الاسباب کی بیخ کنی کرنے کی
فکر میں لگ جائیں۔ وہ اپنے گرد و پیش دیکھیں اگر اُن کا
کوئی مقتدی اُن کا ہمسایہ اُن کا دوست یا اہل شہر کسی انسان
کی خواہش پورا کرنے کے لئے خدا اور رسول کو چھوڑ رہا ہے قرآن
کو پس پشت کر کے قومی مفاد کو کسی دوسرے کی خوشی کے لئے
برباد کر رہا ہے اور اس طرح الٰہی حکموں پر کسی اور کی خواہش
کو ترجیح دے رہا ہے تو اُسے وعظ کریں کہ وہ توحید سے دُور
اور شرک میں گرفتار ہے وہ پیر فقیر منا کر یا قبروں پر جا کر اس قدر
خدا کو ناراض نہیں کرتا جس قدر وہ زندہ بتوں کی پرستش میں
اپنے لئے ابدی جہنم خرید رہا ہے ؛

شرک کی ایک اور خطرناک شکل جس کی بیخ کنی کے لئے سب
سے اول قرآن نے تعلیم دی وہی آج بدقسمتی سے مسلمانوں پر قبضہ
کئے ہوئے ہے۔ وہ بڑا بُت جس کے پاش پاش کرنے کے لئے

سب سے پہلے اسلام نے پتھر اٹھا کر اُسے صدیوں کے لئے چکنا چور کر دیا وہ آج پھر مسلمانوں کا مسجود ہو رہا ہے۔ وہ ہے شرک انسان کا دوسرے انسان کو اپنے برابر نہ سمجھنا میری مراد اُس سے صرف وہی متکبّر انسان نہیں جو دوسروں کو اپنے مقابل ایک آنکھ سے نہیں دیکھتا۔ بلکہ وہ عاجز اور بیکس انسان بھی ہے جو ایک بڑے آدمی کو دیکھکر یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں اس جیسا ہو نہیں سکتا۔ بلکہ میرے نزدیک یہ آخر الذکر گروہ متکبر گروہ کے مقابل زیادہ شرک میں مبتلا ہے۔ اسلام نے توحید پر زور اس لئے نہیں دیا کہ کسی اور کے خدا بن جانے سے خدا کی خدائی میں کچھ فرق آتا تھا۔ حجر۔ شجر۔ نجم۔ شمس و قمر یا کسی انسان کے تختِ الوہیّت پر بیٹھنے سے خدا کا حسد جوش میں آتا تھا۔ اگرچہ بعض مذاہب کا ناقص علم الہیات خدا کو اس جذبہ کا بھی مالک ٹھیراتا ہے چنانچہ توریت کی کتاب خروج باب بیس یا ئیوں کہو کہ موسیٰ کے دس احکام میں سے پہلا حکم انسان کو اس لئے بت پرستی یا شرک سے روکتا ہے۔ کہ اس سے حاسد خدا

کا غصہ بھڑکتا ہے جو انسان کو چار پشت تک گناہ کی سزا دیتا ہے +

قرآن کا خدا ان باتوں سے ارفع ہے۔ اگر کل دنیا شرک سے بھر جائے تو اُس کے جلال میں رتی بھر کمی نہیں ہوتی۔ اور اگر کل کے کل انسان موحد بن جائیں تو اُس سے اُس کے جبروت میں زیادتی نہیں ہوتی۔ اور حق پوچھو تو وہ خدا ہی کیا جو کسی انسان کی ہمسری سے گھبرا جائے انسان کیا اور خدا کی ہمسری کیا؟ جن انسانوں کو انسان نے خدا بنا رکھا ہے۔ وہ رامچندر ہو یا کرشن۔ عزیر ہو یا مریم کا بیٹا۔ خالق ارض والسمٰوات کے آگے اُن کی ہستی کیا ہے ایک ذرہ بے مقدار جن کے لاحق حال طرح طرح کی کمزوریاں ہوں۔ وہ اگر خدا بن بھی گئے تو کیا ہوا۔ خدا کا اس میں کیا بگڑتا ہے۔ ہاں انسان خدا کو چھوڑ کر۔ اگر مخلوق پرست ہو جاتا ہے تو وہ کچھ اپنا ہی گنواتا ہے۔ توحید پر قائم ہو کر وہ اپنا ہی فائدہ کرتا ہے چنانچہ فرمایا۔ ومن یشکر فانما یشکر لنفسہ ومن

کفر فان اللہ غنی حمید۔ خدا انسان کی حمد و ستائش سے غنی ہے۔ حمد اُس کی ذات میں ہے تم اگر اس کی ستائش کرتے ہو اُس میں تمہارا اپنا بھلا ہے۔ ہم اگر کسی کو خدا بناتے ہیں۔ تو خدا کا نہیں بلکہ اپنا نقصان عظیم اس طرح کر لیتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو اُس کے برابر نہ سمجھ کر اُن کمالات سے خود محروم ہو جاتے ہیں کہ جن کے ہونے پر ہم نے اُسے امتیاز خداوندی دے رکھا ہے۔ اُن امور کے علاوہ جو وہبی طور پر انسان کو ملا کرتے ہیں۔ اور اُن میں ایک منصب نبوّت ہے باقی کوئی بھی استعداد کسی انسان کو خدا نے ایسی عطا نہیں فرمائی۔ جو دوسرے کو نہ دی ہو۔ پھر جس وقت تم نے کسی کو خدا بنایا۔ تم میں اور اُس میں مساوات جاتی رہی۔ انسان میں جذبہ ترقی کے اُبھارنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کسی اور ترقی یافتہ انسان کو استعداداً اپنے سے بڑا نہ سمجھے اس حقیقت پر قائم کرنے کے لئے وہ بے عدیل اور بے مثیل انسان جس کی شان میں صحیح طور پر لولاک لما خلقت الافلاک

آیا ہمیں خدا کے حکم سے یہ مژدہ سناتا ہے انما انا بشر مثلکم یوحی الیّ انما الٰھکم الٰہ واحد آپ کہتے ہیں مجھ میں اور تم میں اگر فرق ہے تو یہ کہ خدا نے مجھے اپنا نبی چن لیا ہے اور وہ اس پیغام کے لئے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہی ذات پاک ہے میں تمہیں لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت سمجھانے آیا ہوں۔ ایک اسی کی ذات تم سے بڑی ہے۔ باقی جو کچھ بھی ہے وہ حیثیت میں یا تم سے کم یا تمہارے برابر ہے۔ اور وہ انسان ہے بشر سب سے بڑا اور اس سے بڑا خدا جیسے لفظ بشر آیا وہ تمہارے برابر ہو گیا یعنی کہیں بھی بحیثیت بشر تم جیسا ہی ہوں +

میں آگے چل کر دکھلاؤنگا کہ یہ چند لفظ جو میں نے حدیث نبوی کے ماتحت کہے ہیں کس عمدگی کے ساتھ تہذیب و تمدن کا موجب دار دنیا میں ہوئے ہیں لیکن مجھے یہاں اسی قدر کہنا ہے کہ جب شہنائی نبوّت سے انا بشر مثلکم کا خوش کن نغمہ سنائی دے رہا ہے تو پھر اس مسلمان سے بڑھ کر

اور کون مشرک اور کافر نعمت ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو دوسروں کے برابر نہیں سمجھتا جو کسی صاحب کمال صاحب ہنر، صاحب دولت انسان کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور بے حوصلہ ہو کر بول اُٹھتا ہے کہ مَیں تو ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں وہ استعداد نہیں جو اُس میں ہے جو یہ یقین کر لیتا ہے کہ اُس کو جو مواقع مل گئے تھے وہ مجھے نہیں ملینگے۔ یا اس شخص کے قدم اُٹھانے پر جو افضال خداوندی اس کے شامل حال ہو گئے اُنہیں میرے عمل و حرکت اپنی طرف جذب نہ کر سکینگے۔ الغرض جو انسان ہرچہ انسان کند کند انسان۔ پر عمل نہیں کرتا۔ وہ بڑا بھاری مشرک فی الاسباب ہے۔ اور توحید کے نام تک سے بھی آشنا نہیں۔

اگر قرآن کریم نے بار بار کسی کو خدا بنانے سے روکا تو اس لئے نہیں کہ شرک سے معاذ اللہ خدا کا نقصان ہوتا تھا ایک انسان جب اپنے کمسن بچے کو اپنی نقل اُتارتے دیکھتا

ہے تو ایک حد تک خوش ہوتا ہے۔ پھر کیا زمین و آسمان
کا مالک ہم سے بھی گیا گذرا ہے جو کسی کے خدا بن جانے سے
گھبرا جائے۔ ہم بھی مجازاً اطفال الٰہی ہیں۔ پھر اسی کی طرف
سے مخبر صادق ؐ نے ہمیں تخلقوا باخلاق اللہ کا سبق دیا۔ پھر
اُس کا حدیث قدسی میں ہم سے یہ کہنا کہ تمہارے صحیح طور پر
عبداللہ بننے سے ہم تمہارے ہاتھ پاؤں ہو جاتے ہیں۔ پھر
خود صاحبِ لولاک ؐ کی شان میں اسی وعدہ کے مطابق وَ
ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ (تو نے کنکریاں
نہیں پھینکی ہیں بلکہ اللہ نے پھینکی ہیں) کہکر آنحضرت صلّی اللہ
علیہ وسلّم کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیتا ہے۔ پھر صفات
الٰہیہ مبینہ قرآن میں زیادہ تر حصہ ایسے ہی اسماء حسنیٰ کا ہے
جن کے مناسب حال اخلاق کے حاصل کرنے کی انسان
میں اہلیت موجود ہے۔ یہ سب باتیں اس بات کو ثابت
کرتی ہیں کہ ہمارے کسی انسان کو خدا بنانے پر شائد وہ
چنداں ناراض نہ ہوتا کہ ہم اُس کی شان احدیت میں کچھ فرق

لا رہے ہیں بلکہ اس کی نا رضامندی اِس لئے ہے کہ ہم ایسے انسان کو خدا قرار دیکر اُس شخص کے اُن کمالات کو جن کی بناء پر ہم نے اُسے خدا قرار دیا ہے اپنے دائرہ اکتساب سے خارج کر لیتے ہیں اور اس طرح سب خیر و خوبی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم شرک نہ کرتے تو ہم ان کو اپنی مثل سمجھتے ہم میں ان کے کمالات حاصل کرنے کا شوق ہونا ممکن ہے۔ ہم ان جیسے ہو جاتے مسیح نے تو اپنے شاگردوں کو اپنا مثیل بننے کا راستہ بھی بتلا دیا تھا جب اس معصوم انسان کے پاس اِس کے شاگرد آئے اور استعجاباً دریافت کرنے لگے کہ آپ یہ معجزات کیسے کر لیا کرتے ہیں۔ اور یہ وہ معجزات ہیں جن کی بنا پر آج اُسے خدا کہا جاتا ہے۔ تو اس برگزیدہ نے نہایت صفائی سے حواریین کو کہا کہ تم بھی یہ معجزات کر سکتے ہو۔ تم بھی اس رنگ میں میرے مثیل ہو سکتے ہو اس کیلئے ایمان اور عمل صالح کی ضرورت ہے۔ نماز۔ روزہ اور پابندیٔ شریعت انسان میں یہ قوتیں پیدا کر دیتی ہے۔ قرآن نے تو

ان کمالات انبیاء کا مالک ایک مومن کو ٹھہرایا ہے جس کی
طرف حدیث علماء امتی اشارہ کرتی ہے۔ جناب مسیح کرشن
یا کسی اور انسان کو خدا بنانے سے کس قدر انسانی استعدادیں
اپنے کمال تک پہنچنے سے رہ گئیں جب ان لوگوں تک
شرک کو اسلئے روکا گیا ہے کہ ہم میں سے جذبہ مماثلت نہ مرجائے
تو پھر کوئی پیر یا فقیر یا نام نہاد مرشد کیوں اس حد میں نہ لایا جائے۔ خدا کسی
کے شریک بننے پر کیوں ناراض ہونے لگا انسان کیا اور اسکا شریک
ہونا کیا؟ مثلاً اگر کوئی دیوانہ کسی شہنشاہ کی رعایا میں اسکی ہمسری کا دعوے
کرے اور چند دیوانے اس کی تائید کریں تو بادشاہ سوا
ہنس دینے کے کیا کریگا ہاں جب ایسی ہمسری سے کسی قانون
کی خلاف ورزی ہونے لگے تو پھر وہ ناراض ہوگا بصورت
دیگر اس کی ناراضگی اظہار کم ظرفی نہیں تو اور کیا ہے۔
ان شاہنشاہوں کو تو اُس شہنشاہوں کے شہنشاہ سے
نسبت ہی نہیں اُن کی حیثیت اُس کے مقابل ایک مچھر سے
بھی کم ہے اِس شرک سے خدا کا غصہ اس لئے بھڑکتا ہے کہ

ہم نے ایسا کرنے سے اُن قوتوں کو زائل کر دیا ۔ اور اُن بالقوی کمالات کو بالفعل نہ ہونے دیا جو اُس نے ہماری فطرت میں ودیعت کر دیئے تھے ۔ اُس نے تو یہ عظیم الشان انسان یعنی انبیاء علیہم السّلام اس لئے پیدا کئے تھے اور اُن سے بعض خوق الطاقت باتیں اس لئے سرزد کرا کر انھیں مظہر خداوندی بنایا تاکہ ہم بھی ایسے ہی ہو جائیں ۔ اُن سے بعض خوارق اس لئے صادر نہیں ہوئے کہ وہ ہمارے مسجود اور تکیہ گاہ بن جائیں بلکہ اس اظہار سے مقصد الٰہی صرف اظہار استعداد انسانی تھا ۔ وہ لوگ نمونہ بن کر آئے تھے تاکہ انا بشر مثلکم کی خوشخبری سننے والا کونوا مع الصادقین پر اس لئے عمل کرے کہ ایک دن وہ اُن جیسا ہو جائے اور اُن کی طرح مظہر خداوندی بنے کسی بزرگ سے بیعت کی غرض بھی یہی ہے ۔ بیعت کرنے سے ہم نے پیر طریقت کو نہ تو خدا بنانا ہے ۔ نہ اُسے ہمسر نبی ٹھہرانا ہے ۔ بلکہ اس کے پیچھے ہو کر اُس جیسا بننا ہے اگر یہ مقصد نہیں تو پھر پیر پرستی ہے اور ایک

شرک عظیم ہے جس کے سامنے ایک ہندو کی بت پرستی لاشے ہے بیعت محبت و اطاعت کا وہ مقام ہے کہ جہاں مرید اپنے حالات اور خیالات سے الگ ہو کر شیخ کے رنگ میں قطعاً رنگین ہو جاتا ہے یہی حقیقت فنافی الشیخ ہونے کی ہے۔ اِس سے ایک انسان سمجھ سکتا ہے کہ پیر پکڑنا جو آج رسم ہو رہا ہے اور جس کے لئے نفس پرستوں نے ہر جگہ دُکانیں کھول رکھی ہیں کس قدر احتیاط چاہتا ہے ہم تو مظہریت خدا حاصل کرنے کے لئے کسی راہنما کو چاہتے ہیں اگر وہ خود اس مقام پر نہیں اُسے پیر پکڑنا ہی ایک طرح کا خذلان ہے۔

ہاں تلاش شیخ کا بھی ایک راستہ قرآن سے مستنبط ہوتا ہے۔ مُرشد پکڑ کر جس رنگ میں ہمیں رنگین ہونا ہے اُس کے خط و خال سے قرآن نے ہمیں اطلاع دیدی ہے کہ اگر وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو پیر پکڑنا خطرناک شرک کا مقدمہ ہے۔ اس رنگ کا نام قرآن نے صبغتہ اللہ رکھا ہے۔ یعنی

خدا کا رنگ۔ اسی رنگ میں رنگین ہونے کے لئے تخلقوا باخلاق اللہ کا ارشاد ہوا ہے۔ خدا کے رنگ میں رنگین ہونے سے مراد اپنا جامہ اُتار کر اخلاق خداوندی کا جامہ پہننا ہے۔ انسان چونکہ عملی دنیا میں تعلیم کے علاوہ نمونہ سے کہیں زیادہ تربیت پاتا ہے اور رسول کی شان بھی یہ دونو باتیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ جیسے کہ یزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ اشارہ کر رہا ہے۔ رسول تعلیم اور تزکیہ دونو باتیں کیا کرتا ہے۔ یعنی اپنے عمل اور نمونہ سے دوسروں کی تطہیر کرتا ہے ہاں رسول وہی ہوتا ہے جو اپنا رنگ چھوڑ کر صبغۃ اللہ میں غوطہ لگائے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کا ہر قول و ہر فعل خدا کی منشاء کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کی ہر بات قل ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔ ہوتی ہے۔ وہ دُنیا کو کہتا ہے میرے تمام شعائر مذہبی۔ میرا مرنا جینا۔ کل کا کل اللہ کے لئے ہے۔ یہ انسان کامل اوّل المسلمین اور فنا فی اللہ ہوتا ہے۔ اس مقام پر

کھڑا ہونے والا دنیا کو کہہ سکتا ہے فاتبعونی یحببکم اللہ
اگر تم خدا کی محبت چاہتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اس کا
ہاتھ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ فنا فی اللہ ہو چکا ید اللہ
فوق ایدیھم (جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے
بیعت کرتے ہیں) خدا کا ہاتھ اُن کے ہاتھ کے اوپر ہوتا ہے
اسکے ہاتھ پر ہاتھ رکھکر انسان صبغتہ اللہ حاصل کر سکتا ہے
چونکہ ایسا انسان ہر وقت ہمارے سامنے نہیں ہوتا اس
لئے ہمارا شیخ طریقت وہ ہونا چاہیئے جو فنا فی الرسول ہو کر
فنا فی اللہ ہو چکا ہو۔ اگر کسی کو ایسا شیخ مل جائے اور وہ اُسکی
بیعت میں جا کر حقیقت بیعت ہیبنہ بالا کو اپنے پر وارد کرے
تو وہ فنا فی الشیخ ہوتے ہی فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ
بھی ہو جاتا ہے۔ اُس کا قدم قدم شیخ پر نہیں بلکہ قدم رسول
اور قدم خدا پر ہے اِس لئے ہر کس و ناکس ہماری بیعت کا
مستحق نہیں۔ ہمارا شیخ وہ ہونا چاہیئے۔ جس کا معلم براہ راست
خمیت ماٰب ہو جس کا جامہ خدا کے ہاتھ سے براہ راست

ڈھل کر صبغۃ اللہ میں رنگا ہوا ہو یعنی وہ خدا کا ملہم ہو
اور خلق اللہ کی اصلاح کے لئے خدا کی طرف سے مامور
ہو۔ اسی لئے مجدد دنیا میں آئے چونکہ نبوت ختم ہو چکی شریعت
کا آنا منقطع ہو چکا۔ انسانی ہدایت کے لئے مکمل تعلیم اور
تزکیہ کے لئے عمل معلم کامل قرآن و حدیث کی شکل میں انسان
کو مل چکا۔ اور یہ وہ دو باتیں ہیں جو آنحضرت صلعم سے پہلے
کسی نبی یا معلم ربانی کے متعلق پائی نہیں جاتیں۔ اُن کی
تعلیم بے شک اپنے وقت پر مکمل ہو گی اُن کا نمونہ نسل انسانی
کے لئے کافی ہو گا۔ لیکن تاریخ نے تربیت و تہذیب
انسانی کی ان دو راہوں کو ہم تک اُن کی طرف سے نہیں پہنچایا
جناب عیسیٰؑ جناب موسےٰؑ اور ایسے ہی کسی قوم کا کوئی نبی
ہمارے لئے خاتم النبیین یا دنیا کا ایک ہی نبی ہو سکتا تھا
اگر ہماری ہدایت کے لئے اُس کی تعلیم و سنت کامل رنگ میں
ہم تک پہنچ جاتی مقدس تاریخ اُٹھا کر دیکھ لو۔ اگر اس شرط کو
کوئی ذات پاک پورا کرتی ہے تو وہ ذات پاک محمدؐ ہے۔ اسلئے

جبتک ایسا انسان دنیا میں نہ آئے نبوّت کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا اور جب اُس کا ظہور ہو جائے تو اُس کے بعد کسی نبوّت کی حاجت نہیں رہتی مقصد نبوّت تو انسانی راہنمائی کے لئے اُن راہوں کو پیدا کر دینا ہے جن پر چل کر انسان فنا فی اللہ یا صبغتہ اللہ میں رنگین ہو جائے۔ اور اخلاق الٰہیہ کے جامہ میں ملبوس ہو کر زمین پر خدا کا خلیفہ بنے۔ اب یہ غرض طریق بالا کے سوا اور کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تزکیہ نفس کے لئے انسان آٹھوں پہر نمونہ کا محتاج ہے۔ کوئی شخص تین چار پشت کیلئے ہی نمونہ ہو سکتا ہے۔ اپنی نسل کے لئے یا اُس نسل کی اولاد یا اولاد کی اولاد کے لئے کیونکہ یہ تین نسلیں امکاناً ایک وقت میں جمع ہو سکتی ہیں۔ آنحضرت صلعم کا اپنا زمانہ صحابہ تابعین یا تبع تابعین کا زمانہ اگر خیر القرون بتلایا گیا ہے تو اس کی بھی یہی حقیقت ہے تین نسلیں کم و بیش ایک صدی میں ختم ہو جاتی ہیں اس لئے مصلحت خداوندی نے نبوت و شریعت ختم ہونے پر بعثت مجدد تجویز فرمائی ہے۔

جو صدی کے سر پر اُٹھایا جاتا ہے۔ جو خدا کے ہاتھ سے پاک صاف کیا جاتا ہے۔ غوامض شریعت سمجھنے اور فنا فی الرسول ہونے کے لئے جب کبھی اُسے وقت پڑے وہ براہ راست خدا سے ہدایت پاتا ہے۔ اور اس لئے وہ وقت کا مہدی ہوتا ہے۔ اس شخص کے فنا فی اللہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا یہی وہ شخص ہے جس کو بیعت لینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ہاں بیعت توبہ جس کے معنی صرف اسی قدر ہیں۔ کہ کسی نیک کے ہاتھ پر آیندہ کے لئے گناہوں سے بچنے کا اقرار کرنا اور گذشتہ گناہوں سے توبہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایک امر مستحسن ہے لیکن اگر بیعت سے مراد یہ ہے کہ جس کے ہاتھ پر ہم بیعت کریں وہ ہمارا مرشد اور ہم اُس کے مرید ہوں تو پھر یہ ہاتھ یا نبی کا ہونا چاہیئے یا مجدّد کا۔ کیونکہ ان دونوں کی بعثت خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہی خطاؤں سے معصوم ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کے فنا فی اللہ ہونے یا صبغۃ اللہ میں رنگین ہونے پر ہم ایمان رکھ سکتے ہیں۔ اگر ہم ان کی بعثت کو قبول کر لیں کیونکہ

مقصد اصلی تو فنا فی اللہ ہونا ہے۔ نہ خدا کی جناب میں کوئی سفارشی یا دعا کرنے والا تلاش کرنا۔ اس لئے میری ناقص رائے میں بیعت توبہ کے سوا کسی ایسے ہاتھ پر بیعت کرنا جو فنا فی اللہ ہونے کے مقام پر نہیں۔ جس مقام کی صحیح شناخت صرف نبوت و مجددیت ہی ہے۔ ایک قسم کا باریک شرک ہے۔ بیعت سے غرض خدا کا رنگ اختیار کرنا ہے۔ اگر ہم کسی ایسے کے مرید بن جائیں جو خود اس رنگ میں رنگین نہیں تو ہم غیر اللہ کے رنگ میں غوطہ لگا رہے ہیں۔ بلکہ میرا تو یہ بھی ایمان ہے کہ اگر کسی مجدد کا کوئی قول ہم تک ایسا پہنچے جو منشاء قرآن کے خلاف ہو تو ہم اُس کے پابند نہ ہوں ہم تو فنا فی اللہ ہونے کے لئے فنا فی الشیخ ہوئے تھے۔ اب اگر کوئی اسکا اجتہاد ہماری نگاہ میں تعلیم قرآن کے مطابق نہیں تو پھر اس معاملہ میں اُس کا اتباع ہمیں اپنے مقصد سے دور کرتا ہے۔ ان معاملات میں صحت نیت شرط ہے۔ علاوہ ازیں عموماً یہ وہ باتیں ہوتی ہیں جن کا تعلق اعمال۔ شعار اور شرائع سے نہیں ہوتا۔ فی الجملہ مقصد بیعت

بالا آٹھوں پہر ہمارے سامنے ہونا چاہئے ۔

ہمارے احمدی بھائی اب اِس حقیقت کو سمجھ جائینگے کہ کیوں اِس صدی کے مجدّد حضرت مرزا صاحبؓ نے وصیّت میں یہ لکھدیا کہ اُن کے بعد سلسلہ میں داخل کرنے کے لئے اُن کے نام پر بیعت لی جائے اُن کے خلیفے دنیا جہان کے سجادہ نشین نہ بنیں یعنی اپنے نام پر بیعت لینے کا حق نہیں ہوگا۔ سلسلہ احمدیّت کی خلافت سے مراد صرف اسی قدر ہے کہ کوئی شخص جسے چالیس آدمی چن لیں وہ دوسروں کو جماعت میں داخل کرے۔ ایسا شخص مرشد نہ ہوگا۔ بلکہ اُس میں اور دوسروں میں سلسلۂ اخوت ہوگا ۔ یہ اُس دن تک جاری رہیگا جب تک کوئی اور انسان مسند مجددیت کے لئے خدا کی طرف سے مبعوث نہ ہو۔ یہ باتیں اگر خود مرزا صاحبؓ اپنی وصیّت میں نہ لکھ جاتے تو پھر بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ قرآن کو سامنے رکھکر اور غرض نبوت و مجدّدیت کو سمجھ کر ایک انسان سمجھ سکتا ہے۔ کہ فنا فی اللہ کے مقام پر جو انسان نہیں اُس کی بیعت کرنا غلطی ہے۔ وہ ایک قسم کا شرک ہے

اِن ہی امور کو سامنے رکھکر ہمارے بعض نادان دوست سمجھ بیٹھے ہیں کہ آنحضرت صلعم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا اور مدعی نبوّت خود بالفاظ حضرت مرزا صاحبؑ جیسا کہ اُن کی تصانیف میں جابجا پایا جاتا ہے۔ کافر اور خارج از دائرہ اسلام ہے آنحضرت صلعم کے بعد صدی کے سر پہ مجدد آیا کرینگے۔ اُنہیں ہی حق بیعت حاصل ہوگا۔ دنیا میں امّت محمّدیہ ہر وقت اور ہر جگہ مقام فنافی اللہ پر پہنچے ہوؤں سے خالی نہیں۔ یہ لوگ بھی مستحق بیعت ہیں۔ لیکن چونکہ شناخت مشکل ہے اس لئے ماموریت الٰہی ہی ایک صحیح شناخت ہے جنہوں نے حضرت مرزا صاحبؑ کو مجدّد مان لیا ہے۔ اُن کے لئے کوئی اور مفر نہیں۔ وہ اُس دن تک کسی اُن کے خلیفہ کے ہاتھ پر اُس کے نام کی بیعت نہیں کر سکتے۔ جبتک خدا کسی انسان کو مبعوث نہ کرے۔ وہ یہ بھی یاد رکھیں کہ وہ انسان جسے وہ مصلح موعود کہتے ہیں وقت کا مجدّد ہی ہوگا +

میں نے جو یہ چند سطریں پیری مریدی پر لکھدیں وہ اِس

لئے کہ لوگوں نے نہ حقیقت شرک کو صحیح طور پر سمجھا ہوا ہے نہ مقصد توحید کو وہ جانتے ہیں۔ خدا نے اپنا ایک ہونا اس لئے منوایا کہ وہ انسان کے جذبۂ محبّت کو اپنے لئے خاص کرے۔ اور شدّت محبّت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کے رنگ میں رنگین ہو جائے اس امر پہ خود لفظ محبت اور خلّت روشنی ڈالتے ہیں محبّت لفظ حُب سے مشتق ہے جس کے معنے بھر جانا ہے خلّت کے معنے خالی ہونا۔ جب تک کوئی شخص اپنے قلب پر یہ دو فعل وارد نہ کرے اُس کا دل کسی کی محبّت کا مدعی نہیں ہو سکتا یعنی جبتک اُس کا دل اور علائق سے خالی ہو کر اپنے محبوب کی محبّت سے نہ بھر جائے۔ پہلے اپنے دل کو خالی کرو پھر اُس میں خدا کی محبّت بھرو تو پھر تم خدا کے خلیل اور اُس کے محب بن سکتے ہو۔ یہی پیغام اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ کا ہے۔ اِس لئے جہاں ایک طرف ہمارا معبود ہمارا محبوب ہوتا ہے وہاں ہمارا محبوب ہی ہمارا معبود بن جاتا ہے۔ اِس لئے محبت پیر بعض وقت ہمیں مشرک بنا دیتی ہے۔ جب ہمارے دل کا کوئی خانہ کسی شخص کی محبّت سے

خالی نہیں رہا۔ یا بالفاظ دیگر کسی اور کی محبّت کی جگہ ہی وہاں نہ رہی تو پھر وہ جو چاہیں ہم سے کرالیں ہم مسلمان بن کر کسی اور کو معبود تو نہیں سمجھتے لیکن محبوب کو معبود بنا کر ہم شرک عظیم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فی زمانا لوگ محبت پیر میں خلاف خدا اور رسول کر بیٹھتے ہیں اسی لئے خدا کے مقابل ماسوا اللہ کی محبّت اسلام نے روک دی اس لئے جو شخص فی زمانا مرشد کی اطاعت میں خدا اور رسول کے احکام بھی بھول جاتا ہے۔ وہ بُت پرستوں سے بھی خطرناک مشرک ہے۔ اور مصیبت تو یہ ہے کہ آج امور سیاسی میں بھی یہ سلسلہ پیری مریدی موجب تخریب قوم ہونے لگا۔

مَیں نہ تو میدان سیاسیات میں کھڑا ہوں۔ نہ مَیں اپنے میں سیاسی حقائق کے سمجھنے کی اہلیّت پاتا ہوں۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ نہ اہالیان گورنمنٹ غلطی سے خالی ہو سکتے ہیں نہ اُن کے احکام پر ہر نکتہ چینی مصئون عن الخطا ہو سکتی ہے صحت سیاسیات اسی میں ہے کہ گورنمنٹ کے ہر حکم کو جہاں کالوجی نہ سمجھا جائے وہاں نکتہ چینی اور نیک نیتی پہلو بہ پہلو ہو۔ گورنمنٹ کا ہر ایک

قدم پبلک کی جانچ پڑتال کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ ہاؤس آف کامنز میں جو وقتی گورنمنٹ کے مقابل ایک فریق مخالف ضرور رہتا ہے۔ آخر اس کا اور کیا مطلب ہے؟ بقول پیغمبر صلعم نیک نیتی کے ساتھ اختلاف باعث برکت و رحمت ہو جاتا ہے اختلاف کے ماتحت معاملہ چھن چھنا کر رو براہ ہو جاتا ہے۔ پھر جو امر انگلستان میں صحیح ہے وہ یہاں کیوں غلط سمجھا جاوے۔ اس لئے گورنمنٹ نے یہ امر یہاں بھی جائز رکھا۔ گورنمنٹ کا یہ تو فرض ہے کہ اپنے مفاد کی حفاظت میں اپنے ہر ایک امر کو منوا لے۔ یہ گورنمنٹ کی کوشش جائز ہو گی اور ایسے ہی اس کے مقابل کی کوشش بھی صحیح ہو گی۔ لیکن مصیبت تو اب یہ آن پڑی کہ ہمارے بعض سجادہ نشین اور بعض سلسلوں کے پیر اپنی عزت اسی میں دیکھتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کی حمایت بلا سوچے سمجھے کریں حالانکہ خود گورنمنٹ ایسی حمایت کو پسند نہیں کرتی۔ جب وہ صحیح نکتہ چینی کا خیر مقدم کرتی ہے تو پھر بالضرور ایسی حمایت کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی ہو گی۔ مگر آجکل کے بعض سجادہ نشین ہر ایسے معاملہ

پر اپنے مریدین کے نام ہدایت نامے جاری کرتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کی حمایت میں جلسہ کریں اور تاریں دیں۔ اور مرید دوسری طرف تعلیم یافتہ ہونے پر بھی کچھ ایسے اندھے ہو رہے ہیں کہ وہ مرشد کی منشاء کو پورا کرنا حکم خداوندی سمجھتے ہیں؛

اسلام نے ماسواء اللہ کی محبت کو اسی لئے منافی شان توحید قرار دیا کہ اس سے انسان اپنے قویٰ کو صحیح طور پر استعمال کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ محبت میں اندھا ہو کر محبوب کی ہر بات کو مان لیتا ہے۔ بہتر ہو گا کہ میں موقعہ پر غرض و حقیقت عبودیت پر پر کچھ لکھوں۔ اللہ تعالےٰ نے ہر ایک چیز میں بعض جوہر رکھے ہیں شان ربوبیت اُن جوہروں کو مختلف تربیتوں کے ماتحت اُن کے کمال تک پہنچا دیتی ہے۔ خدا کے جلال کا اظہار کسی چیز کے متعلق اُس وقت ہو گا جب وہ چیز اپنی مضمرہ خوبیوں کو بحد کمال ظاہر کرے۔ ایک سیاہ کوئلہ میں سے گیس کا نکلنا جس سے رات کے وقت ایک تاریک گھر بقعہ نور ہو جاتا ہے۔ ایک عارف کی نگاہ میں جلال خداوندی کے اظہار کا ایک عمدہ نمونہ ہے

ایسے ہی کرشموں پر اُس کا دل خدا کے جبروت کے آگے جھک جاتا ہے ۔ چند فقرات تمجید و تسبیح کا زبان پر لانا حقیقت عبادت پر ہمیں قائم نہیں کرتا ۔ ہم خدا کے عابد اُسی وقت بنینگے جب اُس کی مقرر کردہ راہوں پر چل کر اپنے مخفی جوہر فطریہ کو چمکائیں نماز کا مقصد اصلی ہمیں احکام الٰہیہ کی طرف متوجہ کرنا ہے جیسے کہ قوموا للہ قانتین سے ظاہر ہوتا ہے اور احکام الٰہیہ پر چلنے کا مدعا جواہر مخفیہ کا ظہور میں لانا ہے ۔ اسی لئے تکمیل نفس ہی عین عبادت ہے ۔ اسی سے جلال خداوندی دنیا میں قائم ہوتا ہے ۔ حمد و تسبیح کی بھی یہی حقیقت ہے ۔ حمد میں امور حسنہ خدا کی طرف منسوب کر کے ہم دائرہ انسانی میں وہ باتیں اپنے اندر پیدا کرنے کے ملتجی ہوتے ہیں ۔ اور اپنی تسبیحوں میں امور نازیبا سے خدا کی پاکی بیان کر کے اپنے نفس کو اُن سے بچنے پر متوجہ کرتے ہیں ۔ یہی حقیقت حمد و تسبیح کی ہے و من یشکر فانما یشکر لنفسہ ۔ جو خدا کا حمد و شکر کرتا ہے وہ اپنے نفس کی بہتری کے لئے کرتا ہے ۔ الغرض مقصد عبادت یہ ہے کہ جلال خداوندی

ظاہر ہو۔ اور اُس کے حصول کا بہترین راستہ یہ ہے کہ ہر ایک چیز کے مخفی جوہر ظاہر ہو کر قدرت خداوندی کا ثبوت دیں ایک ادنے اسی چیز میں سے بعض خواص ظاہر ہو کر ہمیں تحیر میں ڈال دیتے ہیں تو پھر انسان تو مسلمۃً عالم صغیر ہے کل قوائے کائنات اُس میں مضمر ہیں۔ اس کے چھپے ہوئے کمال اگر کما حقہ ظاہر ہو جائیں تو پھر کس قدر حیرت و استعجاب کا مقام ہو۔ آج بھی آئے دن کے نئے انکشافات متعلقہ قوائے انسانی ہمیں تصویر حیرت بنا رہے ہیں۔ لہٰذا وہ دن جلال خداوند کے کامل ظہور کا دن ہو گا جس وقت انسان کی کل قوتیں اپنے پورے جوبن پر ہونگی۔ اس ظہور کو عربی زبان میں فلاح کہتے ہیں۔ مذہب اور الہام الٰہی دنیا میں اسی کی خاطر آیا۔ واولٰئک ھم المفلحون جس کے سامنے مذہب کا نصب العین یہ ہو گیا وہ کفارہ پرست ہو سکتا ہے۔ یا اُس کی نگاہ میں عیسائی تھیالوجی آسکتی ہے۔ الغرض مقصد عبادت تکمیل نفس انسانی ہے جو خدا کے مقرر کردہ قوانین پر چلنے سے ہی حاصل ہوتی ہے ان

احکام کی یادآوری کے لئے مختلف ارکانِ اسلام تجویز ہوئے ہیں جن میں سے ایک نماز ہے۔ مانا تم خدا کے سوا کسی کی نماز نہیں پڑھتے تم اب قبروں پر بھی نہیں جاتے۔ تم پیر فقیر بھی نہیں مناتے۔ لیکن اگر کسی کی محبت یا کوئی لالچ تمہیں احکام خداوندی پر چلنے نہیں دیتی اور اس طرح تمہارے قومی حقیقی کام کرنے سے رہ جاتے ہیں تو پھر تم سے بڑھکر اور کون مشرک ہے۔ اِس لئے اگر پیر کو پکڑنا تمہارے نزدیک شعار مذہب ہے تو پھر مقصد مذہب کو بھی ہاتھ سے نہ دو۔ اور وہ یہ ہے کہ تمہارے قوائے مخفیہ ظاہر ہو جائیں۔ اوّل تو یہ دیکھ لو کہ جسے تم مرشد پکڑنے لگے ہو وہ خود کس کمال تک پہنچ چکا ہے۔ اس سے مراد میری کسی کا صاحب توجہ ہونا یا قوّت ارادی کے ذریعہ تسخیر قلوب کی طاقت رکھنا یا شفائے امراض یا بعض وقت صاحب کشف قلوب ہونا نہیں یہ تو وہ انکشافات انسانی ہیں۔ جو آج غیر مسلموں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن وہ جوہر انسانی جو ایک مومن کا نصب العین ہونا چاہئے وہ کچھ اور ہے۔ اُن کی نشان

ہیں "علمائے امتی کانبیائے بنی اسرائیل" آیا ہے۔ اُن کا ایک جوہر استقامت اور ثبات قدم ہے۔ اُن پر اسرارِ شرعیہ اور غوامضِ قرآن کھلتے ہیں۔ اُن کی طہارتِ قلب کا ایک نشان اُن کا فہمِ قرآن ہے۔ وہ مسلمانوں کی وقتی مصیبت کا علاج ہوتے ہیں۔ درود و وظیفہ۔ تسبیح و توجہ اچھی باتیں ہیں لیکن اِس کی کمی نے مصیبت حاضرہ ہم پر نہیں ڈالی۔ تمہارا مقتدا آج وہ ہونا چاہئے جس کے دل پر موجودہ مصائب بجلیاں گرا رہے ہوں جو اسلام کی حالت کو محسوس کرتا ہو۔ جس کی آنکھ پرنم ہو۔ اور جو قرآن کو ہاتھ میں لیکر تم کو اس مصیبت کا علاج بتلائے تم شریعت۔ طریقت۔ حقیقت۔ معرفت کے لفظوں میں مت آجاؤ یہ ایک آلہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو شریعت سے فارغ ہو بیٹھے ہیں صاحب طریقت و صاحب معرفت وہی ہو سکتا ہے جو صاحب شریعت ہو۔ اگر یہ بات مجھ سے تمہیں سمجھ نہیں آتی تو قرآن بھی تمہیں یہی کہہ رہا ہے۔ قد افلح المؤمنون کی پہلی گیارہ آیتیں دیکھ لو۔ کسب سلوک کی چند راہیں وہاں لکھی ہیں

جن کا شروع اور اخیر نماز ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو تم مرشد بناؤ اُس کا کوئی حکم حکمِ خداوندی کے خلاف اگر تم ماننے پر تیار ہو تو تم مشرک ہو۔ تم یہ نہ سمجھو کہ جو اُس کے مُنہ سے نکلتا ہے وہ حکمِ خداوندی ہے۔ یہ وہ شرکِ عظیم ہے جس میں مسلمانوں کا ایک عظیم حصہ پڑا ہوا ہے۔ قرآن کو ہاتھ میں رکھو اور ہدایاتِ مرشد کا موازنہ اُس سے کرو۔ اُس سے تمہاری قوت محاکمہ میں فرق نہ آئیگا نہ تمہارے جوہرِ عقلیہ زنگ آلود ہونگے۔

میں نے ابھی اوپر بیان کیا ہے کہ جلال خداوندی اظہارِ قوائے انسانیہ پر مشتمل ہے توحید کا سبق صرف اسی لئے دیا گیا کہ شرک میں پڑکر تم اس مقصد کو کھو بیٹھتے ہو۔ انسان اور حیوان میں امرِ ممیز اُس کے جوہرِ عقلیہ ہیں اُن کا چمکنا صرف اسی ایک طریق سے وابستہ ہے کہ ہر امرِ پیش آمدہ پر ہم اُسے مسلمہ صداقتوں کی معیار پر جانچیں۔ خود محاکمہ کر کے اُس کے نیک و بد کو سمجھیں۔ پھر صحیح نتیجہ پر آکر ہم اُسے اختیار کریں یا چھوڑ دیں ہمارے ہاتھ میں خدا کی کتاب ہے اُس کے اصولوں پر ہمیں

ایمان ہے۔ وہ ہر امر میں معیار صداقت ہو سکتی ہے۔ پھر جو شخص
کسی دوسرے کی بات کو کالوحی سمجھ لیتا ہے بعض وقت اُسے
قرآن کی تعلیم کے خلاف دیکھکر اِس لئے قبول کرلیتا ہے
کہ وہ اُس کے مرشد کا بتلایا ہوا ہے۔ اُس نے ایک شرک عظیم
کیا خدا کی دی ہوئی ہدایت کی عزت نہیں کی اور خدا کے عطا کردہ
جوہر عقل کو بیکار کر دیا۔ خدا کو شائد اس قدر اس بات کا رنج نہ
ہو گا کہ تم نے اُس کے حکم پر ایک انسان کے حکم کو ترجیح دی۔
لیکن اُس کے غضب کا باعث خاص کر یہ ہو گا کہ تم نے اُسکی
عطا کردہ قوتوں کو ایک شخص کی محبت میں صحیح طور پر استعمال ہی نہیں
کیا بلکہ آہستہ آہستہ بیکار کر دیا۔ اور جو کمالات تم سے متوقع تھے
اور جن کا ظہور ہی ظہورِ جلالِ خداوندی تھا۔ وہ ظاہر نہ ہوئے
اور اس طرح منشاء خداوندی میں ایک انسان کی محبت
روک ہو گئی۔ یہی وہ شرک ہے جس سے خدائے تعالےٰ ہمیں
خاصکر روکتا ہے۔ جب ہم اپنے اُستادوں کو اور مرشدوں کو
خدا بنا دیتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں یہودی کوئی بت

پرست نہ تھے نہ وہ کسی انسان کو خدا اپنائے بیٹھے تھے لیکن قرآن نے اُنہیں انسان پرست کہا اور اُنکے اس اعتراض پر کہ ہم عیسائیوں کی طرح کسی انسان کو خدا نہیں مانتے آیتہ ذیل نازل فرمائی:۔

اتّخذوا احبارھم ورُھبانھم ارباباً من دون اللہ

ترجمہ۔ انہوں نے اپنے علما اور بزرگوں کو خدا کے ساتھ اپنا رب بنا رکھا ہے

یہودی توریت پر اپنے احبار کی رائے کو اور اُن کی تعلیم کو ترجیح دیتے تھے وہ اُن کے احکام کو خدا کا حکم سمجھے ہوئے تھے اُن کے ہاتھ میں توریت تھی جس کی تعلیم کے خلاف ان احبار کے وصایا ہوتے تھے لیکن ان کے پیرو یہ کہکر اُن کی وصیتوں پر چلتے تھے کہ یہی لوگ شریعت کے رازوں کو سمجھتے ہیں۔ ان کی باتیں لاکھ شریعت موسوی کے خلاف ہوں مگر طریقت حقیقت کی راہیں انہیں ہی معلوم ہیں۔ انہیں کی پیروی میں خوشنودئ خدا ہے۔ یاد رکھو کہ اس کا نام خدائے تعالیٰ نے انسان پرستی اور شرک رکھا ہے۔ پھر مسلمانو! تم بتلاؤ کہ آج اس آیت کے مصداق ہو یا نہیں ہو مرشد اور پیر پکڑنا کوئی عیب کی بات

نہیں کسی فن کا حاصل کرنا اُس فن کے پیر و اُستاد کے آگے زانوئے ادب تہ کرنے سے ہی ہوتا ہے۔ مذہب کے پیر و اُستا بھی ہونے چاہئیں لیکن کسی فن کا ماہر اگر اپنے شاگرد کو اُس فن کی مسلمہ اسالیب کے خلاف کچھ کہے تو نہ صرف اُس سے قطع تعلق ہی واجب ہے بلکہ اُسے ماہر سمجھنا ہی غلطی ہے۔ تمہارے ہاتھ میں خدائے تعالےٰ نے دو معیار دیئے ہیں اول عقل و تمیز۔ دراصل یہی حقیقی معیار ہیں۔ دوسرے قرآن وحدیث جو معیار اول کے جوہر کو روشن کرنے کے لئے ہمیں دیئے گئے ہیں۔ جس وقت ہم کسی شخص کی طرف سے کوئی ایسا حکم پائیں جو قرآن وحدیث کے خلاف ہو۔ یا اگر قرآن وحدیث خاموش بھی ہوں تو وہ عقل کے خلاف ہو اُس کو قبول کرنا ہی شرک ہے۔ ایسے احکام پر چلنا مقصد توحید کو تباہ کرنا ہے مسلمانو! اپنے حالات پر غور کرو۔ حقیقت توحید کو سمجھو حافظ شیراز کا یہ شعر

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

کوئی قرآن و حدیث نہیں۔ علی الخصوص جب حافظ کے اشعار لفظی معنوں میں بہت ہی کم لئے جاتے ہیں اور حقیقت اور مجاز انہیں کچھ کا کچھ کر دیتی ہے تو یہاں تم کیوں پیر پرستی کے جواز میں اس شعر کے لفظی معنوں پر عمل کرتے ہو۔ خیر حافظ صاحب کو اُنکے حال پر چھوڑ دو۔ میں تمہیں بالفاظ امام اعظم علیہ الرحمتہ یہ کہتا ہوں

خلاف شرع حکم پیر بر دیوار باید زد
کہ سالک ہم ز بشریت بسا گم کردہ منزلہا

آج بد قسمتی سے مذہبی پیر پرستی کے سوا ایک اور قسم کی پیر پرستی ہم میں پیدا ہو گئی ہے ہم دنیوی معاملات میں ایسے لوگوں کے آگے جھک جاتے ہیں جن کے ہاتھ میں ہمارے بعض مفاد ہمارے نزدیک ہوتے ہیں ہم ان کی اطاعت پیروں سے بھی زیادہ کرتے ہیں۔ یہ ایک نئی قسم کا شرک ہے جو مسلمانوں کے ایک طبقہ میں پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اللہ تعالے ہمیں محفوظ رکھے یہ وہ شرک ہے کہ جو ہمیں مذکورہ بالا پیر پرستیوں سے کہیں زیادہ تباہ کریگا۔ اس کا رنگ خصوصًا امور سیاسیہ میں نظر آرہا ہے۔ وہ

یہ نہ سمجھیں کہ مذہب کو ان دنیوی امور سے کیا تعلق ہے جو شخص
اس وقت کسی کی خاطر قرآن کی کسی تعلیم کو توڑ کر مفاد قومی کو
خطرہ میں لے آتا ہے وہ ایک کافر بت پرست سے بدرجہا
بڑھ کر مشرک ہے ؛

اب اگر امور دینیہ اور کسب سلوک میں ایک موحد کا نصب
العین یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم ان کمالات
کا مظہر ہو جو صالحین سے ظاہر ہوئے تھے۔ تو امور دنیوی
میں تو یہ امر ازبس ضروری ہے۔ ایک مسلمان موحد جو کسی فن یا ہنر
میں کسی ماہر کو دیکھ کر اس جیسا بننے پر ایمان نہیں رکھتا وہ مشرک
ہے۔ توحید کا لازمی نتیجہ مساوات انسانی ہے۔ ہم ایک ہی
قسم کے قویٰ لیکر دنیا میں آئے ہیں۔ مبداء فیاض نے ایک
ہی قسم کا سرمایہ ہماری محنت کے لئے زمین و آسمان میں
جمع کر رکھا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جو کچھ زید کرتا ہے وہ بکر نہیں
کر سکتا۔ یہی منشاء توحید ہے جسے سب سے پہلے اسلام نے
پیدا ہو کر ظاہر کیا۔ اگر اسلام کو صحیح طور پر جمہوریت کا مولد قرار

دیا گیا ہے تو اس کی وجہ بھی اسلامی توحید ہے توحید مساوات انسانی کو چاہتی ہے۔ اس لئے جس سلطنت میں انسانی مساوات کی عزت نہیں کی جاتی وہ منشاء توحید کے خلاف ہے۔ بقول جناب عمرؓ خلافت یا حکومت وہی خدا کے نزدیک درست ہے جس میں ہر فرد ملک کو امور سلطنت میں رائے دینے اور اپنی رائے کو منوانے کا حق حاصل ہے اگر کسی سلطنت کے عمال رعایا کے افراد کو جہانبانی کے قابل نہیں سمجھتے یا وہ وسائل تادیب و تربیت اُن کے قابل حکومت ہونے کے لئے مہیّا نہیں کرتے۔ وہ منکران توحید سے ہیں لیکن ایک مسلم رعایا کا ایسے مشرک کے مقابل علم بغاوت اُٹھانا بھی خلاف تعلیم اسلام ہے۔ اسلام نے اس کے لئے دو ہی راہ رکھے ہیں اولاً اپنے مطالبات کو نہایت جرأت لیکن باغیانہ راہوں سے الگ ہو کر حکام وقت کے آگے پیش کریں اس کا نام حدیث میں جہاد اعظم آیا ہے۔ ایک طرف آنحضرت صلعم کا یہ فرمانا کہ تم ایک حبشی کی بھی اطاعت

کرو اگر وہ تمہارا امیر ہو جائے۔ اور اُس کے خلاف نہ اُٹھو
اور دوسری طرف حاکم وقت کی غلطیوں سے اُس کو جرأت
کے ساتھ اطلاع دینا اور اُس کو اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ان
دو اموں نے دنیا میں سب سے اوّل گورنمنٹ کے مقابل
اُس جد و جہد (ایجیٹیشن) کی تعلیم دی جسے آج پولیٹیکل دنیا
میں کانسٹی ٹیوشنل ایجی ٹیشن کہتے ہیں۔ اہل حبش بدقسمتی سے
ہمیشہ گرفتار غلامی رہے۔ عرب جو اُن کے ہمسایہ تھے اور
اپنی حریت پر مرتے تھے اُن کی نگاہ میں یہ غلام قوم رذیل ترین
خلائق تھی۔ آنحضرت صلعم کے پہلے مخاطب تو عرب تھے۔
اُنہیں یہ وعظ کرنا کہ تم ایک حبشی کے مقابل بھی علم مخالفت
نہ اُٹھاؤ۔ اور اُس کے آگے گردن اطاعت جھکا دو۔ اگر
وہ تمہارا امیر ہے۔ اس سے اصلی غرض اپنی امت میں عزت
قانون و حکومت پیدا کرنا تھی۔ اسلام کے لفظی معنے اطاعت
قانون ہیں۔ بغاوت ایک نہایت ہی مذموم امر ہے۔ اس
سے روکنے کے لئے مسلمانوں کو خطبہ جمعہ میں آیتہ ذیل کی

طرف متوجہ کرنا ایک مسنون امر ہے وینہیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی (اللہ تعالیٰ تمہیں فواحش۔ امور منکرہ۔ اور بغاوت سے روکتا ہے)۔ اسی لئے مسلمانوں کو خفیہ سازشیں کرنے یا خفیہ کمیٹیاں بنانے سے روکا گیا ہے غداری اور خلاف ورزی قانون شان اسلام کے منافی ہے۔ ان سب امور کو سامنے رکھکر اور ان پر کاربند ہو کر ایک مسلمان کا یہ بھی فرض ہے کہ بڑی جرأت کے ساتھ گورنمنٹ کو اُن احکام کی غلطی سے اطلاع دے جو حقوق انسانیت کے خلاف ہیں۔ اور وہ حقوق اُس قوم کو تو یقیناً حاصل ہو جانے ہیں جو علم بردار توحید ہوتی ہے +

خدا کو ایک جاننے کے دو ہی معنے ہیں۔ انسان کو انسان کے برابر سمجھنا اور انسان کے ماسوا دیگر مخلوق کو انسان کا خادم قرار دینا۔ ان دو حقیقتوں کو قرآن نے مختلف پیرایوں میں کھولا ہے۔ اور دراصل یہی دو باتیں تمدن و تہذیب کی جان ہیں۔ اول الذکر سے ایک طرف جمہوریت پیدا ہوئی۔ دوسری

طرف ہر ایک بڑے سے بڑے صاحب کمال کے جوہر بغرض حصول۔ امور مشترکہ ہو گئے۔ دوسری غرض توحید یعنی انسان کے سوا کل مخلوقات کو انسان کا خادم سمجھنا مختلف قسم کے علوم اور طرح طرح کے انکشافات طبعیہ دنیا میں لے آئی۔ جس پر انشاء اللہ بالتفصیل ہم آگے چل کر بحث کرینگے۔

یہاں مجھے امر اول کے متعلق کچھ اور کہنا ہے۔ ایک موحد مسلمان کا فرض ہے کہ گورنمنٹ کو ان راہوں کے اختیار کرنے کی طرف متوجہ کرے جن سے حاکم و محکوم قوم کے حقوق میں مساوات پیدا ہو۔ غیر مسلم کے ماتحت رہنا منافی شان مسلم نہیں ممالک دینے اور چھیننے خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ زمین کی حکومت کی عنان انہیں ہاتھوں میں دیتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ذیل کی آیات اس کی شاہد ہیں۔ ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔ ہم زمین کا وارث انہیں کو کرتے ہیں جو میرے صالح بندے ہیں جن میں حکومت

کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہاں ارض سے مراد زمین یا زمین کا کوئی حصہ لے لو یا ارض مقدس مراد لے لو۔ واقعات حاضرہ نے نتیجہ ایک ہی کر دیا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی ہمیں ذیل کی آیات کو بھی سامنے رکھنا چاہئیے۔ اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر۔ ملک کا کسی کو دینا یا کسی سے چھین لینا۔ یا کسی کو ذلیل یا معزز کر دینا خدا کے خیر و خوبی والے ہاتھوں میں ہے۔ اس آیت کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو رضا وتسلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئیے۔ وہ سمجھ لیں کہ اگر اُن کے بھائیوں کے ہاتھ سے ممالک چھینے گئے تو پھر آیات بالا کے ماتحت چھینے گئے۔ جنہیں دیئے گئے وہ خدا کی طرف سے اسی وجہ پر دیئے گئے۔ ہاں جب اُن میں بھی وجوہ انتخاب خداوندی نہ رہینگے اُن سے بھی ملک لے لیا جائیگا۔ مگر ان باتوں کو جو میں کہہ رہا ہوں مسئلہ خلافت سے کچھ تعلق نہیں وہ ہماری مذہبی انسٹی ٹیوشن ہے۔ اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ ہمارے

ان مذہبی مطالبات کو عزت سے دیکھے۔ قیام خلافت اور
ماموئیت امکنہ مقدسہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں جس کا
شاہد قرآن ہے۔ ان دونوں میں خلل اندازی گویا ایک مذہبی
خلل اندازی ہے +

وہ وجوہ اہلیت سلطنت جسکے ہونے پر کسی قوم کو بلا امتیاز
مذہب کوئی ملک مل جاتا ہے وہ عدل و نصفت شعاری ہے
جس کا روشن پہلو حقوق انسان میں مساوات قائم کرنا ہے
زید و بکر کے تنازعات طے کرنے میں عدل و انصاف کو ہاتھ
سے نہ دینا تو ایک معمولی شان حکومت ہے حقیقی نصفت
شعاری کسی حکومت میں تب سمجھی جاتی ہے جب مختلف اقوام
رعایا میں تمیز قومی مٹ جائے اور سب ایک نظر سے دیکھے
جاویں۔ مسلمان اگر کسی ایسی گورنمنٹ کی پالیسی کے ساتھ
تعاون نہ کریں جس میں حقوق انسانی کا خون ہوتا ہو۔ تو مسلمان
خدا کی منشاء کے خلاف نہ جائینگے۔ وہ توحید کے پرستار ہیں
مساوات حقوق انسانی اُن کا مذہب ہے۔ وہ گورنمنٹ سے

ادب کے ساتھ مطالبہ کریں کہ گورنمنٹ ایسے قوانین میں ترمیم کرے اگر کوئی ایسا قانون ہو جو رام کرشن، اور جان مل میں تمیز کرتا ہو۔ فی الجملہ گورنمنٹ کی تعلیم میں اکتسابی۔ سیاسی۔ مالی وغیرہ وغیرہ پالیسی محکوم قوموں کے ساتھ وہی ہونی چاہئے جو اُن کے اپنے ہاں ہو۔ ایک ہندوستانی کے کسی غیر ملک میں جاکر رہنے اور وہاں عزت سے روٹی کمانے کے لئے گورنمنٹ کو وہی آسانیاں پیدا کر دینی چاہئیں۔ جیسی کہ وہ اپنے ہمقوم کے لئے کرتے ہیں۔ مثلاً ہم اکسفورڈ اور کیمبرج میں جاکر انگریزوں سے گوئے سبقت لے جاتے ہیں تو پھر کیوں اُسی قسم کی یونیورسٹیاں ہندوستان میں نہیں بنتیں۔ کیوں ہمارا نصاب تعلیم اُس طرح کا نہیں۔

الغرض اس قسم کے مطالبات گورنمنٹ سے کرنا ایک مسلمان موحد کا فرض مذہبی ہے۔ مذہب دنیا میں چند ایسے اعتقادات اور عبادات کی تعلیم دینے ہی نہیں آیا جس سے کوئی مفروضہ خدا خوش ہو کر ہمیں بہشت کا سرٹیفکیٹ عطا کرے مذہب کی

غرض تو قوائے انسانی کی آبیاری ہے اور جن ذرائع سے وہ قویٰ نشوونما پائیں وہ کل انسانوں کے لئے یکساں طور کھلے ہونے چاہئیں۔ کیونکہ ہر انسان ایک ہی قسم کے قویٰ لیکر دُنیا میں آیا ہے۔ یہ ایک بدیہی صداقت ہے اس کے خلاف یقین رکھنے والا۔ یا ایسے اسباب پیدا کرنے والا جن سے اس مساوات کا خون ہو وہ دشمن توحید ہے اس کی اصلاح کرنا۔ ایک امر دین ہے اُسے یہ باتیں سمجھانا بھی تبلیغ اسلام ہے۔ ہاں ایسا کرنے میں ہمیں لا اکراہ فی الدین کو سامنے رکھنا ہے۔ یعنی دینی امور کی ترویج میں سختی واجب نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی گورنمنٹ رعایا کی ایسی باتوں پر کان نہ دھرے۔ اسپر بھی ایک مسلمان کا حق نہیں کہ وہ بغاوت کرے۔ یا خفیہ سازشیں کرے۔ وہ تبلیغ امر حق میں نہ جھکے۔ وہ قانون کی عزت کرتا ہوا گورنمنٹ کو اسکی غلطی سے آگاہ کرنے سے باز نہ آئے۔ خواہ اسپر مدت دراز گذر جائے۔ ہاں جب گورنمنٹ اس کا مُنہ بند کرنے کیلئے

اُس کی جان کی ہی فکر میں ہو جائے تو اُس وقت ہمیں بغاوت نہیں بلکہ ہجرت کرنا ہے ہجرت کا بھی موقعہ و محل ہے مجھے تو سمجھ ہی نہیں آتی کہ کن وجوہ سے یہ موقعہ ہندوستان میں پیدا ہو گیا +

جہاں میں نے چند باتیں توحید کے نکتہ خیال سے گورنمنٹ کے متعلق کہی ہیں ۔ وہاں اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہمیں اُن مسلمانوں کو وعظ کرنے کی ہے ۔ جن کا برتاؤ دوسرے انسان کے ساتھ برابری کا نہیں ۔ وہ یاد رکھیں کہ ذات پات کی تمیز توحید کے منافی ہے ۔ خدا کی جناب میں کسی کی عزت و تکریم کسی کے شیخ ۔ سید ۔ مغل ۔ پٹھان ہونے سے نہیں بلکہ تقوےٰ ہی ایک ادنیٰ قوم کے انسان کو خدا کی نگاہ میں سید سے کہیں زیادہ مکرم کر دیتا ہے ۔ اور ایک نام کے سید کو اُسکی بدعملی خدا کی نگاہ میں رذیل بنا دیتی ہے ۔ جب خدائے تعالےٰ نے ذات پات کو اڑا دیا تو پھر جو ان باتوں کا گرویدہ ہے وہ مشرک ہے ۔ اس لئے جو انسان دوسروں کو اپنے برابر نہیں سمجھتا بلکہ نظر حقارت سے دیکھتا ہے ۔ اُس سے بڑھکر اور

کون مشرک بن سکتا ہے +

خلق اللہ کا سب سے بڑا محسن وہ انسان ہے جو ہر ایک انسان کے دائرہ استعداد کی حقیقی وسعت سے اُسے اطلاع دے۔ ہندو قوم نے ذات کی تمیز قائم رکھکر لکھو کھا انسانی استعدادوں کا خون کر دیا۔ شودر قوم کے افراد صدیوں تک اپنی ذلت سے نہ نکل سکے۔ آج بھی اُن کے یہاں ایک چمار نسلاً بعد نسلاً چمار ہی رہتا ہے۔ لیکن اگر وہ مسلمان ہے تو کل کا چمار آج کفش دوز ہے پھر کفش فروش پھر تاجر بوٹ پھر تاجر چرم پھر خدا چاہے تو ملک التجار بن جاتا ہے۔ یہ سب توحید کی برکتیں ہیں جس نے امتیاز قومی کو ایک شرک قرار دیا۔ پھر اُس تعلیم کے ہوتے ہوئے۔ اگر مسلمانوں میں ہندوؤں کی طرح امتیاز قومی رہے تو وہ مشرک ہیں۔ یہ شرک آج ہم میں ہے۔ اور اس کا دور کرنا ازبس ضروری ہے۔ اور شرک کے دور کرنے کے لئے تمہیں باجماعت نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے جہاں کسی قسم کی تمیز حرام ہوتی ہے۔ جہاں حکم ہے کہ ایک بادشاہ وقت کا کندھا

ٹخنہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کے ٹخنہ اور کندھے سے چھو گئے اگر اتفاق وقت نے انہیں پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا ہے۔ پھر اگر مسجد کی چار دیواری میں یہ امر ضروری ہے تو مسجد سے باہر آن کر اس مساوات پر تم کیوں نہیں چلتے تم کہو گے کہ وہ خدا کا گھر ہے تو پھر مجھے وہ گھر یا جگہ بتا دو جو خدا کا گھر نہ ہو۔ تم نے ایسا کرنے سے دو قسم کا شرک کیا۔ ایک تو دوسرے انسان کو اپنے جیسا انسان نہ سمجھا اور دوسرا بیرون از مسجد مقاموں کو تم نے کسی اور کا سمجھا یہ پانچ وقت کا سبق تمہیں اسی لئے دیا گیا کہ تم مسجد سے باہر آکر بھی دوسروں سے برابری کا سلوک کرو۔ اُن میں پھر اس جذبہ مساوات کو زندہ کرو جو تمہاری نخوت و تکبر نے دلوں سے مٹا دیا ہے۔ اُن کو اس طرف متوجہ کرو کہ جو تمہیں حاصل ہے۔ اس کے حصول کی استعداد اُن میں بھی ہے۔ اور اگر سعادت تمہارے حصہ میں ہو تو ان عاجزوں کو جو تمہارے طبقہ کو طبقہ خداوندی سمجھے ہوئے ہیں وہ اسباب مہیا کر دو کہ جن کو استعمال کر کے وہ تمہارے ہم طبقہ ہو جائیں۔ یاد رکھو

حقیقی مواحد و مومن وہی ہے جو دوسروں میں حریت اور مساوات کی رُوح پیدا کرتا ہے۔ اس موقعہ پر میں خصوصاً اہل حدیث صاحبان کو مخاطب کرتا ہوں۔ وہ اب اپنے مواعظ توحید کے دائرہ کو بڑھاویں۔ پیر پرستی اور قبر پرستی۔ کوئی اتنا سنگین شرک اُن امور کے مقابل نہیں کہ جن سے حریت و مساوات کا خون ہوتا ہے۔ اہل حدیث علماء کسی قدر نظر وسیع کریں۔ مسلم سوسائٹی کے ہر پہلو پر غور کریں جس جگہ بھی اُنہیں تقویٰ دین داری۔ خدمت اسلام کے سوا اور یہ دراصل تقویٰ کی ہی مختلف شکلیں ہیں۔ کوئی اور وجہ امتیاز نظر آئے۔ اس کی بیخ کنی کرنے کا فکر کریں۔ جہاں کہیں اور جس کسی نے کسی انسان کو ایسے امر کے اختیار کرنے سے روکا جو کوئی اور کر سکتا ہے اُسے شرک قرار دیں اس کا دور کرنا حالات موجودہ کے ماتحت پیر پرستی اور قبر پرستی کے جھگڑوں سے زیادہ مفید ہے۔ وہ گیارھویں منانے والے لوگوں پر اس قدر ناراض نہ ہوں بلکہ وہ اُن لیڈران قوم کو متنبہ کریں جو ہر ایسے امر کی حمایت میں کھڑے

ہو جاتے ہیں جس سے حقوق انسانی کا خون ہو جاتا ہے۔ جس سے حریت و مساوات تباہ ہوتی ہے۔ یہ لیڈر ہمارے مقتداء سید عبدالقادر گیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے بعض نام لیواؤں سے کہیں بڑھکر مشرک ہیں۔ یہ قوم کو تباہ کرتے ہیں اور دوسرے اگر غلطی کرتے ہیں تو اس کا اثر اُن کی ذات تک محدود ہوتا ہے۔

حریت یا مساوات ایک نعمت ہے جو ایمان بر توحید کا صحیح ثمرہ ہے۔ لیکن اس کے صحیح مفہوم پر قادر نہ ہونے نے دنیا میں بہت نقصان کیا۔ اُس نے وہ مذموم آزادی دنیا میں پیدا کر دی ہے جسے انگریزی میں لائسنس کہتے ہیں۔ جس کا مفہوم شائد ہمارا فقرہ "مادر پدر آزاد" ادا کر سکتا ہے۔ اِس سے نہ حفظ مراتب رہتا ہے۔ نہ مستحقین عزت ہم سے عزت حاصل کرتے ہیں جس سے تمدّن و تہذیب کو نقصان پہنچتا ہے۔ بدقسمتی سے مغربی تعلیم کا بھی اثر ہندوستانی طبائع پر ایسا ہی ہوا ہے بعض مغربی آداب و اخلاق شاید مغربی حالات کے مناسب حال ہونگے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کا نام سوئے ادب

اور گستاخی ہے۔ یا ممکن ہے ہم اُن کے صحیح استعمال سے ناواقف ہوں +

بعض اخلاق حسنہ و ذمیمہ بنیاداً کچھ آپس میں ایسے مربوط ہوتے ہیں کہ بعض وقت ہمارا ایک خلق ذمیمہ ہمیں حسنہ نظر آتا ہے۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ وہ دراصل ایک ہی جذبہ کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ یعنی طبعی حالت میں وہ ایک چیز ہوتے ہیں لیکن محل و موقعہ رذیلہ یا فاضلہ لباس پہناتے ہیں مثلاً ہٹ و استقامت اپنی طبعی حالت میں ایک ہی چیز ہے ایک اولوالعزم اور ایک ضدی دونوں اپنی بات پر اڑنے والے اور اپنے مقام سے نہ ہٹنے والے ہوتے ہیں لیکن ہٹ بدرجۂ اتم جہاں ابلیس کی شکل اختیار کرتی ہے۔ وہاں کمال استقامت محمدؐ صبیا انسان پیدا کرتی ہے۔ بہت سے نادان بچپن سے ہی ضد و ہٹ کے خوگر فتنہ ہو کر اسی کو بعد میں شان اولوالعزمی سمجھ لیتے ہیں۔ اور اُن کے دمساز اس کی اِس شان کو اور بڑھاتے ہیں۔ ایسے پیروں اور بزرگوں کے بچوں میں اس عادت

کا پیدا ہونا بالکل ممکن ہے جن کے مرید اُن کی اولاد کو محض
اولاد ہونے کی وجہ سے ابتدا ہی سے اپنا مرجع بنا لیتے ہیں
اس قسم کی ایک اور مثال بزدلی و منکسر المزاجی میں پائی جاتی ہے
ہم بعض وقت جسے انکسار سمجھتے ہیں وہ دراصل بزدلی ہوتی
ہے۔ اخلاق کے اس باریک فلسفہ کو قرآن نے ہی کھولا۔ خدا
نے اگر توفیق دی تو اس مضمون پر لکھنے کو دل چاہتا ہے۔ اسی
طرح "مادر پدر آزادی" اور حریت طبعی حالت میں ایک ہی
چیز ہے لیکن ان دونوں کے محل و موقع کی شناخت نہ ہو تو ایک
شخص جو دراصل پیدائشاً خلیع الرسن ہوتا ہے وہ غلطی سے مدعی
حریت ہو کر حفظ مراتب ہاتھ سے دیدیتا ہے۔ حالانکہ حفظ
مراتب وہ نعمت ہے جس کے بغیر سوسائٹی چل نہیں سکتی۔
میں یہاں کوئی لمبی چوڑی بحث اس مضمون پر کرنا نہیں چاہتا
صرف اشارتاً چند باتیں کہونگا جس سے ہمارے نوجوان حریت
اور خلیع الرسنی میں تمیز کر سکیں ایک شخص بزدلی اور حلم میں بذات
خود تو آسانی سے تمیز کر سکتا ہے۔ لیکن ایک غلط کار کے

غلطی کے مقابل خاموش ہو جانا بعض جگہ حلم اور بعض جگہ بزدلی اور بعض جگہ استکبار کی وجہ سے ہوتا ہے۔
استکبار کا مقام اُس وقت ہوتا ہے جہاں غلط کاری کسی ادنیٰ کی طرف سے پیدا ہو ازراہ نخوت اس پر توجہ نہ کریں وہ ایک الگ چیز ہے لیکن بسا اوقات ہم غلط کار کو محض بزدلی کے باعث متنبہ نہیں کرتے اور اُس کا نام ہم نے حلم اور چشم پوشی رکھا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن ہم خوب سمجھتے کہ یہ ہماری خاموشی ازراہ حلم و چشم پوشی نہیں بلکہ اس کا باعث بزدلی یا ضرورت وقت ہے پس یہی مقام حریت کا ہے۔
اس مقام پر خاموشی اختیار کرنا حریت کا خون کرنا ہے ہاں جہاں غلط کاری کسی سنگین رنگ میں نہ ہو اور وہاں خاموشی حلم۔ یا چشم پوشی۔ ذریعہ اصلاح ہو جائے۔ وہاں بولنا شان حریت نہیں رکھتا۔ لیکن حریت اور گستاخی ہیں جہاں نوجوان تمیز نہیں کر سکتے تو آپ ایسے معاملات میں اُن کی رائے زنی ہوتی ہے جس کے وہ اہل نہیں ہوتے جس بات کی اُنہیں

سمجھ بھی نہیں ہوتی اُس پر نکتہ چینی کرنا وہ ثبوت آزادی سمجھتے ہیں۔ انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ یونیورسٹی کی کوئی ڈگری اُنہیں ہمہ دان نہیں کر سکتی نہ اُنہیں یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ جو اُنکے مُنہ میں آئے کہہ بیٹھیں۔ اُنہوں نے غلطی سے دخل در معقولات اور ڈھٹائی کا نام حُریت سمجھ رکھا ہے۔ قرآن نے اُس کا علاج مختلف پیراؤں میں کیا لیکن یہاں میں ایک بات پر اکتفا کرونگا جس کی مسلمانوں کو سخت ضرورت ہے۔

جہاں صاحب لولاک مساوات حقوق انسانی پر زور دیتے ہوئے اور انسانوں میں "ہر چہ انساں کند کند انساں" پر عملاً ایمان پیدا کرنے کی خاطر انا بشر مثلکم فرماتے ہیں۔ وہاں نسل انسانی کو اس خطرہ سے بھی بچانے کے لئے کہ کہیں جنون مساوات ان میں وہ روح آزادی نہ پیدا کر دے کہ جس کے ماتحت وہ صاحب کمال لوگوں سے لاپرواہ ہو کر یا اُن کی شان میں گستاخی سے پیش آکر اکتساب کمال سے رُک جائیں۔ بحکم خداوندی ارشاد کرتے ہیں۔

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ اگر تم چاہتے ہو کہ خدا کے محبوب بن جاؤ اور ان راہوں کو اختیار کرو جنسے تم اسکے پیارے ہو جاؤ تو میں اس فن کا ماہر ہوں میں اس مقام پر کھڑا ہوں میری پیروی کرو ان دو آیتوں کو ملا کر پڑھو تو تم اس وقت کو حل کر لو گے یعنی مساوات انسانی کا مژدہ اسلئے نہیں دیا گیا۔ اور نمبر راز لسّوبہ اس لئے نہیں کھولا گیا کہ تم جوش حریت میں آ کر ہر دوسرے کی پگڑی اچھال دو نمبر تو یہ راز کھولا گیا ہے کہ تم استعداداً ایک بڑے سے بڑے آدمی کے برابر ہو۔ لیکن استعداد کو بالفعل کرنا نوبت دور ہے۔ اس لئے اگر بالقوی استعداد اور نشو ونما یافتہ استعداد کسی رنگ میں برابر نہیں ہو سکتی تو پھر ایک بے کمال اور ایک صاحب کمال گو ایک ہی جامۂ بشریت سے ملبوس ہیں برابر نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اگر تم ایک عظیم الشان انسان کو دیکھ کر مرعوب ہو جاتے ہو اور یہ خیال کر لیتے ہو کہ تم اس جیسے نہیں ہو سکتے یا وہ تم کو حقارت سے دیکھتا ہے اور ہیچمدان دیگرے نیست کے زعم میں ہے۔ تو پھر تم دونوں

انا لبشرا مثلکم کی عزت نہیں کرتے تم دونوں مشرک ہو اور میرے نزدیک یہ وہ شرک عظیم ہے کہ جس کی مغفرت وہ جہان چھوڑ اس جہان میں بھی نہیں ہوگی لیکن اگر تم اس شخص کا حفظ مراتب اس لئے نہیں کرتے کہ وہ تم جیسا انسان ہے یہ تو تم خطرناک غلطی نہیں بلکہ گناہ عظیم کے مرتکب ہو اور یہی وہ مقام ہے جہاں حرّیت اور گستاخی میں تمیز نہیں کرسکتے بعض کے نزدیک تو یہ امر انسان کو زندیق بنا دیتا ہے۔

الغرض حق مساوات انسان کا ایک پیدائشی حق ہے۔ یہ توحید کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اسی سے حریت جمہوریت پیدا ہوتی ہے اسی سے ہر فن وکمال کا دروازہ ہر ایک انسان پر کھل جاتا ہے۔ اسی سے کمال تمدن وتہذیب کا کوئی مقام کسی خاص فرد یا قوم کی ملکیت بلا شراکت غیر نہیں ہو جاتی اور جو شخص یا جو قوم ان حقوق انسانی میں دخل اندا ز ہے وہ خطرناک مشرک ہے۔

حرّیت کی بحث میں جہاں ایک غلط کار کی غلطی

پر خاموش ہو جانے کا ذکر ہے وہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ بعض
مواقع کی خاموشی بھی شان توحید کے خلاف پڑتی ہے۔ اور
ایمان بالتوحید کے اس حصہ کو باثمر ہونے نہیں دیتی جس کا
تعلق اطلاق فاضلہ سے ہے۔ ہماری ضروریات لاحقہ نے
ہمیں آٹھوں پہر رجاء و بیم کے مقام پر کھڑا کر رکھا ہے۔ یہ مقام
جہاں ہر قسم کے خیر و برکت کا موجب ہوتا ہے کیونکہ ضرورت
لاحقہ کا پورا کرنا ہی ایک طرف ہماری قوتوں کو حرکت میں
لے آتا ہے۔ اور نتائج کے متعلق امید و بیم دوسری طرف
ہم میں حزن و احتیاط پیدا کرتا ہے۔ وہاں یہ ہی دونوں باتیں
یعنی ضرورت لاحقہ کا پورا کرنا اور ثمرات عمل کے متعلق امید
و بیم بعض وقت ہمارے لئے باعث شقاوت ہو جاتی
ہیں جس شخص نے دفعیہ ضرورت کے لئے کسی اور کی طرف
دیکھا اور اپنے قویٰ پر بھروسہ نہ کیا یا ثمرات عمل کے لئے
ذات باری کے سوا کسی اور کو محل امید و بیم سمجھا اس نے
اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ یہ ایک شرک عظیم ہے۔ اور آج مسلمان

جیسی ہو جد قوم اس میں مبتلا ہے۔ اس شرک عظیم سے بچنے کے لئے خدا تعالےٰ نے ایک طرف تو یہ فرمایا لا نضیع اجر العاملین
اللہ ولی الذین آمنوا ھو یتولی الصالحین۔ ومن یتوکل علی اللہ وھو حسبہ یعنی اللہ تعالےٰ نے تو کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا وہ تو مومنین کا مربی اور پشت پناہ اور صالحین کا متولی ہو جاتا ہے۔ اور جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے وہ اس کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پھر بار بار قرآن میں ذکر آیا کہ خدا تعالےٰ نے تمہارے لئے کافی ہے۔ اور دوسری طرف لا تخشوھم واخشونی کا حکم دیا۔ ہماری فطرت کا خالق ہماری کمزوریوں سے آگاہ ہے۔ اس نے ہماری ضروریات اور ہماری امید وبیم کو مولد شرک ہونے سے روکنے کے لئے ہمیں اطلاع دی۔ کہ ہم اس کے سوا کسی پر بھروسہ نہ رکھیں۔ ہم اپنی ضروریات کے دفعیہ کے لئے کسی اور کی طرف نہ دیکھیں اگر ہم صحیح طور پر اپنے قویٰ کو استعمال کرینگے تو ہماری محنتیں ضرور مثمر ہونگی ہم سو لئے اس کے

کسی سے نہ ڈریں اور امرِ حق کے بیان کر دیتے ہیں اس لئے کسی سے خوف نہ کریں کہ وہ ہمیں نقصان پہنچائیگا۔ اگر خدا کا حکم ہمیں ایک امر کی ہدایت کرتا ہے اور اُس کے خلاف کوئی اور شخصیت جس سے ہمیں خوف و امید ہے ہم سے کچھ اور کرانا چاہتی ہے تو پھر حق توحید یہ ہے کہ ہم اُس شخصیت کی پروا نہ کریں۔ اور لا تخشوھم واخشونی۔ یعنی خدا فرماتا ہے ”ان سے مت ڈرو مجھ سے ڈرو“ انما ذالکم الشیطان یخوف اولیاۂ فلا تخافوھم وخافون ان کنتم مومنین یہ تو شیطانی وسوسے ہیں جو تمہارے دلوں میں غیروں کا خوف و خطر ہے اُن سے کیا ڈرنا جو شیطان کے دوست ہیں۔ تم خدا سے ڈرو +

کسی بت کے آگے جھک جانا۔ کسی بزرگ کا دن منا لینا تو شائد کوئی لمبا چوڑا شرک نہیں۔ جس قدر خطرناک مذکورہ بالا شرک ہے اگر مقصد توحید مکارم اخلاق کا پیدا کرنا ہے۔ تو شرک عظیم یہ ہے کہ ہم اس دنیا کی نکمی سے نکمی ضروریات

کے ماتحت لا تختنوھم واخشونی پر عمل نہ کریں۔ اس سے قسم قسم کے اخلاق حسنہ کا خون ہو جاتا ہے۔

سورہ بقرہ کے پہلے چند رکوع پر غور کرنے سے گناہ کی دو اصل بنیادیں نظر آتی ہیں۔ ایک اپنی قوتوں کو اُنکے حدود مقررہ سے زیادہ سمجھنا۔ دوسرا اُن کا کم سمجھنا یا بالفاظ دیگر اپنے قوائے کے متعلق استکبار و استخفاف کرنا پہلے سے کبر اور دوسرے سے منافقت پیدا ہوتی ہے۔ کبر سے غرور۔ نخوت۔ نکتہ چینی۔ شیخی۔ لاف زنی اور ان کی ملحقہ بد اخلاقیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ بزدلی اور منافقت سے نامردی۔ کذب وافترا۔ اور خوشامد اور دیگر عادات رذیلہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ قربان جاؤں قرآن کے اُس کے علم اخلاق کے کیسے کیسے عقدہ لاینحل اُس نے چند لفظوں میں حل کر دیئے۔ خیر قرآن کی ان خوبیوں کے منکشف کرنے کا مقام یہ نہیں۔ انشاءاللہ کوئی اور ہوگا یہاں اس قدر کہنا کافی ہے کہ ہر قسم کے گناہوں کی جڑ اپنے قوائے کا استکبار یا استخفاف ہے۔ لیکن ان

دونوں میں سے جو امر ہم پر وارد ہو رہا ہے وہ استکبار نہیں نہ ہمارے وہ حالات رہے کہ ہم اُس غلطی کی طرف جائیں۔ اس جماعت کی ایک شناخت سواءٌ علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون ہوتی ہے۔ ہمارے دن استکبار کے نہیں ہیں تاہم ہم میں سے اکثروں کا موجودہ نقشہ قرآن نے یوں کھینچ دیا ومن الناس من یقول اٰمنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھم بمؤمنین ۰۰۰۰۰ واذا لقوا الذین اٰمنوا قالوا اٰمنا۔ واذا خلوا الی شیٰطینھم قالوا انا معکم انما نحن مستھزءون۔ اِن آیات کی تفسیر کی ضرورت نہیں خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے ابتدا ہی میں پہلے اُس جماعت کا ذکر کر دیا ہے جو اس سے مستفید ہوگی یعنی متقی۔ اُس کے بعد دو جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ جن میں استکبار ہے جس سے ان میں لاپرواہی پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جن میں استخفاف قوای ہے اور اس سے اُن میں نفاق پیدا ہوتا ہے وہ لوگ جو استکبار کے گڑھے میں گرے ہوتے ہیں اُن کے

مشرک اور کافر ہونے میں کیا شبہ ہے۔ لیکن وہ جو ان کے
استکبار سے مرعوب ہو جاتے ہیں جیسے ہم مسلمان ہیں وہ
بھی موحد نہیں۔ وہ نہ صرف اپنی خدا داد قوتوں کی تحقیر کرتے
ہیں بلکہ لاتخشوھم واخشونی سے لاپرواہ ہو کر شرک کے
گڑھے میں گرتے ہیں۔ جو شخص اس حکم ربی کی عزت کرے گا
ممکن نہیں کہ وہ غیر اللہ سے بیجا طور پر ڈرے۔ یہی شخص منافقت
سے بچکر اخلاق فاضلہ کا وارث ہو سکتا ہے۔ گویا توحید کی
حقیقت پر قائم ہونا ہی انسان میں اخلاق ستودہ پیدا کرتا
ہے جسے ہم کسی قدر تفصیل سے آگے چل کر بیان کرینگے؛

ہاں اس جگہ یہ کہدینا ضروری ہے کہ خوف کا بھی ایک
مقام محمود ہے۔ جو خوف محبت و عزت سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ
ایک امر حسنہ ہے لیکن جو خوف استبداد و استکبار کے
مقابل پیدا ہوتا ہے وہ ایک امر مکروہ ہے۔ اور وہ ایک
قسم کا شرک ہے۔ اگر ہم مسلمانوں کو قانون وقت کے توڑنے
سے خوف کرنا چاہئے تو اس لئے نہیں کہ اس قانون کے بنانے

والے کون ہیں بلکہ اس لئے کہ قانون وقت کی عزت کرنا اور قیام
قانون سے محبت رکھنا ایک اسلامی شعار ہے اسلئے اگر ہم خلاف ورزی
قانون سے ڈرتے ہیں تو یہ اس محبت و عزت کا تقاضا ہے کہ جو قرآن
پر ایمان رکھنے والے کے دل میں قانون نافذالوقت سے پیدا ہو جاتا ہے
الغرض ظلم تعدی جو خوف پیدا کرتی ہے وہ شرک ہے اور فدائی توحید کا
فرض ہے کہ اپنے دل کو اس سے آزاد رکھے ہاں وہ خوف جو محبت و عزت پیدا
کرتی ہے اس سے دل کا یکیف ہو جانا ایک موحد کی زیب
و زینت ہے۔ اگر دنیا کی حکومتیں محکوموں کے دلوں میں
اپنی محبت و عزت پیدا کرنے کی راہیں اختیار کریں تو یہ اسکے
استحکام پر مہر لگا دیگی ورنہ حکومتِ خوف کبھی قائم نہیں رہ سکتی
الغرض جو شخص لاالہ الااللہ پر ایمان لاتا ہے اُس کا ایک
ہی دستورالعمل ہونا چاہئیے کہ وہ جو کچھ کرے خدا کی خوشنودی
کے لئے اگر خدا کی خوشنودی اور ناراضگی کی راہیں اُس کے
سامنے کھلی ہوئی ہیں اور ایک مسلمان کے لئے قرآن اس امر
میں کافی ہدایت نامہ ہے تو پھر حق توحید اسی وقت ادا

ہوتا ہے جب ایک انسان ہر نقل و حرکت میں خدا کی خوشنودی سامنے رکھتا ہے۔ اس کی محبت اور اُس کا غصہ خدا کے لئے ہونا چاہئے۔ وہ اپنے اہل و عیال کی اپنے متعلقین کی پرورش اس لئے کرے کہ خدا کی کتاب نے اُسے ایسا ہی کہا ہے۔ وہ حق دوستی۔ حق ہمسائیگی حق شہریت اِس لئے ادا کرے کہ قرآن اُسے ایسا کہتا ہے۔ وہ گورنمنٹ کی۔ خواہ وہ کسی قوم کی ہو۔ اس لئے اطاعت کرے کہ خدا کی کتاب اُسے ایسی ہی ہدایت کرتی ہے۔ اور یاد رکھو کہ انسانی حقوق اور ذمہ واریوں کی کوئی شاخ کوئی نوعیت۔ ملکی۔ مجلسی۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ منزلیہ الغرض جو جو ہمارے حقوق ہیں اور جو جو ہم پر ذمہ واریاں ہیں ان سب کی حدبندیاں خدا نے اپنی کتاب میں کر دیں۔ اُن پر چلنا حق توحید کو ادا کرنا ہے اور اُن کے خلاف جانا اپنے آپ کو مشرک بنانا ہے۔ اس طرح تمہارا توحید پر قائم ہونا تمہیں بہت سی مصیبتوں سے بچا لیگا۔ اور تم بہت سی غلط

راہوں سے نجات پالوگے علاوہ ازیں جب قرآن کی حکومت تلے کسی امر پر کھڑے ہوجاؤگے تو تمہاری قوت ایمانیہ تم میں دس گنا طاقت پیدا کردیگی۔ اور یہ میں نہیں کہتا یہ وعدہ قرآن کریم کرتا ہے۔ خدا کے ملایک تمہاری مدد پر کھڑے ہوجاویں گے۔ تم میں پھر یکجہتی پیدا ہوجائیگی جو آج تم میں نہیں۔ وہ توحید ہی کیا ہے جس پر چل کر لوگوں میں وحدت پیدا نہ ہو۔ مثلاً یہی مسئلہ عدم تعاون کے متعلق غور کرلو۔ واللہ العظیم میں اس مسئلہ کو اگر اس لئے صحیح مانوں کہ اس کا تعلیم دہندہ مہاتما گاندھی ہے جس کی بے نفسی کے متعلق فرض کرلو کہ مجھے کوئی شک نہیں تو میں موحد نہیں۔ اگر اس مسئلہ کی اس لئے عزت کروں کہ مولانا محمود الحسن۔ مولانا ابوالکلام۔ عبدالباری۔ اور شوکت علی اس کے مؤید اور اسپر عامل ہیں تو میں مشرک ہوں میں لا الہ الا اللہ کہکر بالفاظ نبوی لامقصود لی الا اللہ۔ لامطلوب لی الا اللہ۔ لا قاضی لی الا اللہ۔ لامتبوع لی الا اللہ کے خلاف جانا شرک عظیم سمجھتا ہوں

جب میرا ایمان ہے کہ قرآن و حدیث میں میری ہر ضرورت
کا علاج ہے تو پھر ان دو سے باہر کسی علاج کا ڈھونڈنا بھی
شرک ہے میں مسئلہ عدم تعاون کی فی نفسہٖ صحت پر اور اس کے
اپنے محل پر استعمال کرنے پر اس لئے ایمان رکھتا ہوں کہ قرآن
مجھے کہتا ہے۔ تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی
الاثم والعدوان۔ اس لئے ہمارے لیڈروں کا فرض ہے
کہ وہ ہر ایک معاملہ کو قرآن کی روشنی میں ہمارے سامنے
پیش کریں پھر اس پر کوئی کسی غیر مذہب کے ماتحت ہونے کا
الزام نہیں دے سکتا۔ قرآن نے تعاون اور عدم تعاون
دونوں کے لئے اصول باندھ دیئے ہیں۔ اگر تم قوم میں یکجہتی
پیدا کرنا چاہتے ہو تو پھر ظلم و عدوان کے مقابل ہمیں عدم
تعاون کا حکم دو۔ تم جن امور میں عدم تعاون میں زور دینا
چاہتے ہو اس کو قرآن و حدیث کی روشنی میں ظلم و عدوان
ثابت کر دکھاؤ۔ اس طرح ہر معاملہ میں خدائے واحد کے
مقررہ حدود کے اندر رہنا ہی شان توحید ہے۔ اگر ہیں

ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہوں تو اس لئے نہیں کہ بعض نادانوں کے قول کے مطابق میں پہلے ہندوستانی ہوں اور پھر مسلمان ہوں۔ یہ ایک نہایت ہی گِرا ہوا۔ اور مذیل شانِ اسلام فقرہ ہے۔ اگر بعض امور میں برادران وطن کا میں ساتھ دیتا ہوں تو اس لئے کہ میں مسلمان ہوں حقوق وطن داری شعار اسلام ہے اور صلاحیت کے کاموں میں شرکت کرنا ایک مسلمان کو قوم اور ملک کے دائرہ میں محدود نہیں کرتا۔ امر نیک میں اس کی شرکت بلا تمیز مذہب و قوم کل دنیا کے ساتھ ہے۔ اسی طرح امور شر میں ایک مسلمان کو ہند و چھوڑ اپنے گھر کے لوگوں کی شرکت سے بھی الگ ہو جانا پڑتا ہے ہم موحد قوم ہیں۔ خدا کے حکم کے مطابق اہل وطن کیا ہم اپنے والدین کی بھی نہیں سن سکتے۔

میں نے شروع میں یہ لکھا ہے کہ کل اخلاق فاضلہ توحید پر ایمان لانے سے حاصل ہو جاتے ہیں اس کی مختصر تفصیل یہی ہے جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ جب تمہاری محبتیں

اور تمہارے غصے تمہاری جانبداریاں اور تمہاری مخالفتیں تمہارا کسی امر کو اختیار کرنا یا چھوڑ دینا محض خدا کے لئے ہو جائے اور اسی اصول کے ماتحت تمہارے سب رشتے اور تعلقات آجائیں تو پھر ممکن نہیں کہ تم میں کوئی بد اخلاقی ہو ہاں خدا بھی خدائے قرآن ہو۔ اور اس کے صفات اور اسماء بھی وہی ہوں جو قرآن نے بیان کئے ہیں۔ تو پھر اس قسم کے موحد اخلاق فاضلہ کا مجسمہ ہوں گے۔ وہ مظہر خدا ہونگے پھر کونسی دقت ہے کونسی مشکل و مصیبت ہے جو حل نہ ہو جائے گی مسلمان موحد ہوتے تو نہ انہیں فی زمانہ تلوار چلانیکی ضرورت تھی کیونکہ حسب فرمودہ مخبر صادق یضع الحرب کا وقت ہے اور تلوار عنقریب ہمیشہ کے لئے نیام میں جانے والی ہے۔ نہ انہیں برادران وطن کی کاسہ لیسی کی ضرورت ہے۔ نہ انہیں کوئی شور و غل کرنے کی حاجت ہے ما انہیں صرف قرآن پر چلنے کی ضرورت ہے وہ اگر بروئے قرآن و حدیث کسی امر کا حاصل کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اور اسے خدا کا حکم جانتے

ہیں تو پھر اُس کے مقابل ہر ایک دنیوی مفاد کو محبت و عزت سے دیکھنا خصوصاً جب وہ مفاد اُن کی اُس غرض کے خلاف پڑے۔ شرک سمجھیں۔ روپیہ پیسہ۔ مکان لباس وطن۔ رشتہ دار۔ بیوی۔ بچے۔ ان سب چیزوں کو ہم ارکان اسلام کی ادائیگی میں چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ شان توحید یہی ہے کہ جس بات کو ہم خدا کی طرف سے سمجھیں اُس کے حصول میں ماسوا اللہ سے تعلق نہ رکھیں۔ بغاوت کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ قرآن کے خلاف ہے۔ تلوار اٹھانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندوستان میں تمہارے خلاف تلوار نہیں اٹھی کسی قسم کے فساد کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمیں لاتفسدوا فی الارض کا حکم ملا ہے۔ صرف رُوح توحید کے اُس حصہ کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس کا نام میں روح ہجرت رکھتا ہوں۔ اس سے تم میں شان اولوالعزمی پیدا ہو گی جس کے آگے بڑے بڑے متکبروں کی گردنیں جُھک جایا کرتی ہیں۔ اسی سے وہ عقیدت پیدا ہوتی

ہے کہ جن کے مقابل کھنچی ہوئی تلواریں نیام میں جاکر تلوار والوں کو غلام بنالیتی ہیں۔ یہ مقام مشکل تو ہے لیکن محالات سے نہیں۔ بشرطیکہ ہم نے اور مذہب والوں کی طرح شعار مذہب ادا کرنے کو ایک کل کا چلانا نہ بنا دیا ہو۔ ہماری عبادات کا مقصد یہی تھا کہ ہم حقیقت ہجرت پر قائم ہوجائیں جبتک ہم اس مرحلہ کو طے نہ کرلیں ہم میدان توحید میں قدم رکھنے کے قابل ہی نہیں۔ یاد رکھو۔ لاالہ الا اللہ وہ آگ ہے جو ہر قسم کی خواہش۔ تمنا۔ آرزو کے خس وخاشاک کو خصوصاً جبکہ ان کا سرچشمہ نفسانیت وبہیمیت ہو جلا ڈالتی ہے۔ اور تم میں سے اس شعلہ کو روشن کر دیتی ہے۔ جسے کوئی باد مخالف بجھا نہیں سکتی۔ کیا تمہاری شمع ہستی ایک ادنی سے ادنیٰ ہوا کے جھونکے کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ اگر نہیں تو یاد رکھو کہ تمہیں توحید سے آشنائی نہیں۔ تم صرف سچے موحد بن کر نفس کے اُن تقاضوں سے بالا ہو سکتے ہو۔ کہ جن کی حکومت تم سے لباس عزم وہمت چھین کر تمہیں

بے دست و پا کر دیتی ہیں*۔ کوچہ توحید میں وہی قدم رکھ سکتا ہے جو دنیوی عزت وذلت کا رہین نہیں رہتا۔ اسکی

* یہ قیمتی خیالات جو حضرت قبلہ خواجہ صاحب نے اس جگہ ظاہر کئے ہیں وہ ایک خطبہ کی شکل میں نہایت خوبصورتی سے گذشتہ عید الفطر پر آپ نے فرمائے۔ خصوصاً اس میں اُسی روح ہجرت کا بھی ذکر کیا جس کا اشارہ سطور بالا میں آچکا ہے۔ قارئین کتاب کے فائدہ کے لئے اُسے ذیل میں درج کر دیا ہے۔ خواجہ عبد الغنی مترتب کتاب

خطبہ عید الفطر فرمودہ حضرت مولانا خواجہ کمال الدین صاحب مسلم مشنری ایدہ اللہ بنصرہ

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لاشریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین۔ دنیا کے لوگوں کو اطلاع کردو کہ میرا مرنا جینا چلنا پھرنا کھانا۔ پینا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ نماز روزہ جملہ شعائر مذہبی۔ الغرض میری زندگی کے کل کاروبار کا مقصد رب العالمین کی خدمت ہے۔ یعنی ان مقاصد کے پورا کرنے کے لئے ہے۔ جو ربوبیت عالم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان مقاصد کی بجاآوری میں میں اُسی رب العالمین کے احکام پر چلتا ہوں۔ اور اس میں اس احدیت مآب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا میری زندگی کا

قدم ہمت کو اُس کے منزلِ مقصود سے کوئی ہٹا نہیں سکتا
آج ہم ذلیل سے ذلیل مقام پر کھڑے ہیں۔ رفعت و بلندی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸۳) نصب العین میرا اپنا تجویز کردہ نہیں ہے۔ یہ راستہ اللہ تعالےٰ نے میرے لئے مقرر کر دیا ہے۔ ہاں میں اس کی فرمانبرداری میں سب سے سبقت لے گیا ہوں۔ اس لئے میری زندگی انہیں امور میں خرچ ہوتی ہے +

میں نے اس مقدس آیت کا تفصیل کے ساتھ ترجمہ کر دیا ہے جو دنیا کے بڑے سے بڑے انسان کی زبان پر تیرہ سو برس سے زیادہ ہوئے الہاماً جاری ہوئی اگر اس آیت شریفہ کے ان الفاظ کو بنظر تعمق دیکھا جائے تو یہ الفاظ دراصل کلمۂ توحید یا ایمان بالتوحید کی عملی تفسیر ہے۔ خدا کو ایک جاننا اور اُن شعائرِ مذہبی میں جن کو عرفاً لوگ عبادت کہتے ہیں۔ کسی کو اس کا شریک نہ کرنا۔ یا ضرورت پر دفع ضرورت کے لئے اُسی ایک ذات کو مخاطب کرنا۔ اور اس کے سوا اپنی حاجات کو کسی اور طرف نہ لے جانا۔ یہ ایک ادنےٰ درجہ کی توحید ہے۔ اگرچہ آنحضرت کی بعثت تک انبیاء کرام آتے رہے۔ اور بہی پیغام توحید لاتے رہے۔ لیکن کوئی بھی اس موٹے سے موٹے مسئلہ توحید کو نہ سمجھا۔ بحمداللہ حقیقی معلم توحید آیا اور اس نے کچھ اس طریق پر اس غلیظ اور موٹے شرک کا دنیا سے قلع قمع کیا کہ آج مشرک سے مشرک قومیں بھی اس شرک غلیظ سے من وجہ انکار کر رہی ہیں۔ لیکن

کو گنوا کر قعر ذلت میں گر چکے ہیں۔ ہاں اس سے نکلنے کیلئے
ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اہل الرائے مختلف نسخے تجویز کر

(بقیہ صفحہ ۸۴) حقیقی منزل توحید تو بہت دور ہے۔ یاد رکھو خدا تعالےٰ
اس لئے توحید پرستی پر زور نہیں دیتا کہ اس میں اس کا کوئی ذاتی نفع ہے۔
وہ کوئی حاسد خدا نہیں جیسا بائیبل اس کو ظاہر کرتی ہے۔ کہ وہ کسی اور
کے خدا بننے سے بگڑ بیٹھے۔ یہ مسیح یہ کرشن یہ رام چندر یہ دیگر معبودان مخلوقات
اس احدیت مآب کے سامنے خس و خاشاک کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ تم کل کے
کل بت پرست ہو جاؤ مشرک بن جاؤ۔ اس کی عظمت میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا
اگر تم آج بت پرست نہیں یا شرک کی موٹی راہوں سے بچے ہوئے ہو
تو تم ابھی توحید کے دروازہ پر کھڑے ہو۔ حقیقی توحید تو یہ ہے کہ تم اور
تمہاری زندگی کا مقصد تمہارے بیم و رجا
کا موجب تمہارے امید اور خوف کا باعث صرف ایک ذات باری
ہو۔ اور یہ اس لئے کہ جس کا نام سیرت یا کیریکٹر ہے وہ اسی توحید سے
پیدا ہوتی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ بعض شخصیتوں کا خوف تم سے وہ
باتیں کرا گذرتا ہے۔ جو تمہارے نزدیک بھی مکروہ ہیں دنیا میں ہمارے
کل اقوال و افعال کا محرک یہی بیم و رجا یہی خوف و طمع ہوتا ہے۔ لیکن اگر
تم کامل موحد بن کر اس حکم پر عمل کرو۔ لا تخشوھم واخشونی (ان سے
مت ڈرو مجھ سے ڈرو) تو گویا کسی کا خوف تم سے تمہاری منشاء کے خلاف

رہے ہیں لیکن میں توکل قومی ترقی اُس جذبہ توحید پر عامل ہونے سے کلیتاً وابستہ سمجھتا ہوں۔

(بقیہ صفحہ ۸۵) یا تمہارے قومی اور ملی مفاد کے خلاف کچھ کرا سکتا ہے۔ اسی توحید کا سبق دینے کے واسطے تم کو کہا گیا ہے وللّٰہ خزائن السمٰوات والارض۔ تم جو بعض باتیں اپنی قوم اپنی کانشنس اپنے مذہب اور اپنی ضمیر کے برخلاف اس خیال سے کر گزرتے ہو فلاں شخص سے ہم کو کسی رنگ میں کچھ دولت مل جاوے۔ تو یاد رکھو کہ دنیا کے تمام خزاین اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ تم ان لوگوں کی پرواہ کیوں کرتے ہو جن کو تم صاحب ثروت سمجھتے ہو۔ پھر تمہارے کیریکٹر کو مضبوط کرنے کے واسطے تمہارے جملہ مصائب و شدائد کو اللہ تعالےٰ اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔ اکثر مصائب و شدائد کا خوف بھی ہم سے بعض اخلاق سے گری ہوئی باتیں کرا گزرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔ ولنبلونکم بشیٍٔ من الخوف یعنی یہ خوف اور مصائب جو اکثر تمہیں آتے ہیں۔ ہماری طرف سے آتے ہیں اور اُن کا مقصد تم کو تکلیف دینا نہیں۔ بلکہ دنیا میں سب سے بڑا کامیاب انسان وہی ہوتا ہے۔ جس میں اوروں سے بڑھ کر صبر و استقامت کا جوہر ہوتا ہے۔ جب تک یہ جوہر انسان میں نہ ہو۔ انسان لاشے ہے کسی ادنےٰ سے ادنےٰ فتوحات کا نام لو۔ صبر و استقامت کے سوا وہ حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور یہ دونوں جواہر تم میں استعداداً موجود ہیں۔ لیکن ان کا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸۶) ظہور مصائب و شدائد کے سوا نہیں ہو سکتا پھر کیا یہ خداوند تعالیٰ کا بہت بڑا احسان نہیں کہ وہ تمہارے جوہر کو اس طرح چمکا دے۔ ولنبلونکم میں لفظ بلاء بہت معنی خیز ہے۔ "بلاء" کے معنی آگ میں ڈال کر سونے کو صاف کرنے کے بھی ہیں۔ اور اسی واسطے عطاء کے معنے بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آتش بلا میں ڈال کر تم کو کندن بنایا جاتا ہے۔ اس کندن کا جوہر کیا ہے؟ صبر و استقامت۔ چنانچہ اس کے بعد اس کی طرف ارشاد ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وبشر الصابرین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون ؕ

بشارت اس بات کی کہ ان میں صبر پیدا ہو گیا ہے۔ اگر کیریکٹر فی زمانہٖ ایک عظیم الشان دولت تسلیم ہو چکی ہے۔ تو پھر یاد رکھو کہ یہ دولت آتش بلا میں ہی گذرنے سے آتی ہے۔ لیکن اس آتش کا مقابلہ وہی انسان کر سکتا ہے۔ جو عملاً انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ سکتا ہے۔ جو مصائب کو دیکھ کر یہ کہنے کی قابلیت رکھتا ہے کہ اگر ہم دنیا میں راحت کے واسطے آئے تھے۔ یا مصائب سے بچنا ہی ہمارا مقصد زندگی ہوتا تو بیشک یہ مصائب زندگی ہم کو تکلیف دیتے۔ مگر ہم تو اللہ کے ہیں۔ اور اسی کے لئے جیتے ہیں۔ مصائب کا ہم سے تعلق ہی کیا ہے۔ ایک اور بات بھی دنیا میں کیریکٹر کو تباہ کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ وہ مفروضہ عزتوں کا حصول ہے۔ مثلاً آج کل کے خطابات اور عہدہ جات دنیا کے لوگوں سے بہت کمینہ حرکات کرا دیتی ہیں۔ گویا یہ لوگ عزت کے بت کے آگے سجدہ کرنے کے

لئے اپنی قومی اور ملی مفاد کو تباہ کر دیا کرتے ہیں۔ اور یاد رہے۔ کہ قوم
ومذہب پرستی ہی بہت حد تک خدا پرستی ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے
اس مشرکانہ فعل سے بچانے کے لئے جس کی وجہ سے ان کا کیریکٹر تباہ ہوتا
ہے۔ یوں ارشاد باری ہوتا ہے وللہ العزۃ ورسولہ۔ یہ عزتیں
جن کی طرف تم دوڑ رہے ہو۔ محض بے حقیقت ہیں ماصلی اور حقیقی عزتوں کا
مالک خدا تعالےٰ اور اس کا رسول ہے۔ تم اُن اصولوں کو مت اختیار کرو
جن سے قومی اور ملی عزتیں تباہ ہوں تم خدا اور رسول کی عزت دنیا میں قایم
کرو۔ خدا تعالیٰ تمہاری عزت قائم کر دیگا۔ تم کل عزتوں کا مالک خدا تعالےٰ
کو سمجھو تو پھر تم سیرت واخلاق سے نہیں گروگے میں نے ابھی کہا کیریکٹر
ہی بڑی دولت ہے۔ کیریکٹر ہی سے قوم میں حکومت پیدا ہوتی ہے۔
اور کیریکٹر ہی سے انسان دنیا کا لیڈر ہو جاتا ہے۔ اور خوب یاد رکھو کہ
یہ کیریکٹر صرف توحید پرستی سے حاصل ہوتا ہے۔ اور توحید سکھانے کا
مقصد بھی یہی ہے کہ تمہارے نفس کی تکمیل ہو جاوے۔ تمہارے
پوشیدہ جوہر ظاہر ہو جاویں۔ یوں تو کل کا کل قرآن اسی مقصد کی تکمیل
کے واسطے بھرا پڑا ہے۔ لیکن میں انہیں چند آیتوں کو تمہارے سامنے
کرتا ہوں جو میں نے شروع میں تلاوت کیں تم لا الہ الا اللہ کے سرشار
ہو اور اس پرستش کا عملی رنگ یہ ہونا چاہئے۔ کہ سب سے اول تم دنیا
میں کسی کا خوف نہ کرو۔ خدا تعالےٰ کے خوف کے مقابل کسی اور طاقت
کا خوف تم کو صحیح راہوں سے الگ نہ کر دے۔ خوف کی تین وجوہ ہو سکتی

ہیں۔ مال عزت کے متعلق امید وبیم۔ مصائب کا آنا۔ اب ان تینوں حقائق کو تم نے قرآن پاک کی ان تین آیتوں سے حاصل کر لیا۔

(۱) للہ خزاین السموات والارض۔

(۲) العزۃ للہ والرسول۔

(۳) ولنبلوتکم بشیٔ من الخوف .... الی آخرہ۔

تم توحید کی اس اسپرٹ کو ذرا اپنے اندر پیدا کرلو۔ اور دنیا سے بیخوف ہو جاؤ اور دولت و عزت خدا تعالیٰ سے مانگو۔ مصائب کو خدا تعالیٰ کی رحمت سمجھو کہ وہ تمہارے کیریکٹر کے واسطے ضروری ہے پھر بتلاؤ کہ کون دنیا میں ایسی قوت ہے جو تمہارا بال بیکا کرسکتی ہے جس قدر مصائب تمہیں اس وقت آرہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ تم نے اوروں کو اپنا خدا بنایا ہے۔ اور ان کو قبلۂ حاجات سمجھا ہوا ہے۔ تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ تمہاری عزت اور راحت ان کے ہاتھ میں ہے اور اگر وہ چاہیں۔ تو تم کو تکلیف دے سکتے ہیں۔ ان خیالات سے باز آجاؤ۔ اور اپنی عزت رفتہ واپس لے لو۔ اسی سبق توحید کے سکھانے کیواسطے تمہیں ایک اور نصیحت کی گئی ہے۔ فرمایا لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا مما تحبون۔ یعنی کیریکٹر یا سچی سیرت اسی کو حاصل ہے۔ جو خدا کی راہ میں خدا کے لئے اپنی محبوبات سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ دنیا نے طرح طرح کے فلسفے تلاش کئے کہ لوگوں سے بدی دور رہے مختلف مذاہب اور ملل کی تعلیمات دنیا سے بدی اور فسق و فجور مٹانے کے واسطے آئیں لیکن حقیقی راز

سے ناواقف ہونے کے سبب بدی کا علاج نہ کرسکیں۔ قرآن کریم نے ہمیں نہ صرف اُس سچے فلسفہ سے اطلاع دی جس پر عمل پیرا ہونے سے گناہ اور بدی کا قلع قمع ہوجاتا ہے۔ بلکہ ہمارے لئے چند ایسے مشقی کورس بھی رکھ دیئے ہیں۔ جن کے اختیار کرنے سے ہم اصلی مقاصد کو پالیں۔ کیا آپ لوگوں نے کبھی غور کیا کہ بدی کا ارتکاب کیونکر ہوتا ہے ہم کو چند ضروریات لاحق ہیں۔ ان ضروریات کا دفعیہ چند چیزوں کے حصول سے وابستہ ہے۔ وہی چیزیں ہم کو عزیز ہوجاتی ہیں۔ کسی چیز کے پیارے یا عزیز ہونے کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ وہ چیز کسی نہ کسی ہماری ضرورت کا علاج ہے اسی کا ناجائز حصول بدی کہلاتا ہے۔ بدی سے بچنے کا صحیح علاج یہ ہوگا کہ ہم اپنے اندر کچھ ایسی عادت ڈالیں۔ کہ جس کے ماتحت جائز طریق پر حاصل شدہ چیزیں جو ہم کو محبوب ہیں۔ اپنے سے بطیب خاطر جدا کرسکیں۔ جو شخص اپنی چیز کو جس پر اُس کو مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔ بہ آسانی کسی اور کو دے سکتا ہے۔ وہ غیر کی چیز پر کیوں نگاہ ڈالے۔ اسی لئے فرمایا لن تنالوا البر تم ہیں کیریکٹر پیدا ہو ہی نہیں سکتا جب تک تم اپنی محبوب چیزوں کو اپنے سے جدا کرنا نہ سیکھو۔ تم مادی دولت کو ہاتھ سے دیکر اُس دولت کو حاصل کرو جس کا نام بر ہے۔ جسے اخلاق فاضلہ کہتے ہیں۔ جسے انگریزی میں کیریکٹر کا نام دیا گیا ہے۔ پھر اُس کے حاصل ہونے کے بعد تم ہاتھ سے دی ہوئی دولت سے لاکھ گنا زیادہ پیدا کرسکتے ہو۔ تم دنیا کی دولت دنیا کی عزت کے متعلق ان اشعار کو جو جذبہ

توحید کی پرستاری ہیں ایک دن میری قلم سے نکل گئے اپنے حسب حال کرلو پھر دیکھو کہ تم دنیا کی نگاہوں کا تارا بنتے ہو یا نہیں۔ اور دنیا تمہارے پیچھے آتی ہے یا نہیں۔

کسی سے دل کو لگا چکے ہیں جزا محبت کی پا چکے ہیں
دوئی کو دل سے ہٹا چکے ہیں ہم اپنی ہستی ہٹا چکے ہیں

کہاں کی عزت کہاں کی ذلت کہاں کی پستی کہاں کی رفعت
کسی کے در کے جو ہو چکے ہیں یہ دل سے سب کچھ بھلا چکے ہیں

نہ بیم و امید کے تقاضے نہ رنج و راحت سے لینا دینا
جو دولتِ دل ہی دے چکے ہیں وہ سارے قرضے چکا چکے ہیں

مضائقہ کیا اگر جدا ہم سے آشنا مال و عز و جاہ ہوں
قدم جو اُٹھنا تھا اُٹھ چکا ہے ہم اُن کے کوچہ میں آ چکے ہیں

نہیں وہ آتے نہ آئیں تو کیا نہ کوئی حسرت نہ آرزو ہے
جو کچھ بھی باقی رہا تھا دل میں وہ خون کر کے بہا چکے ہیں

یہ کس نے توڑیں مری امیدیں میں اس پہ قرباں کہ کفر ٹوٹا
تھے نقش امید غیر جتنے وہ لوح دل سے مٹا چکے ہیں

یہاں کی عزت انہیں مبارک اسیر جاہ و نمود جو ہوں
فقیر تو فرش خاکساری پہ اپنے بستر جما چکے ہیں

کئے خوشی سے جو دست خالی غنا نے کی آ کے دست بوسی
کسی کی دولت کو کیا کریں وہ جو اپنی دولت لٹا چکے ہیں

نہ درد کے چارہ گر اگر ہوں تو بن کے ناصح نہ یار آئیں
ہر ایک لغزش پہ خاررہ کو عصاء راہ ہم بنا چکے ہیں
کسی کے رستے میں خاک ہونا کمال رفعت سے بالاتر ہے
تمہاری باتوں کو کیا کریں ہم جب اس حقیقت پہ آ چکے ہیں

الغرض تم اپنی کمائی ہوئی دولت خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ اپنی عزت اپنی آسائش کی چیزیں اور وہ چیزیں جن سے تم کو محبت ہے مثلاً اپنا وقت کل وشرب تعلقات زناشوئی عزیز واقارب۔ مکان ووطن لباس اور سب سے آخر جسم کی آسایش خوشی سے ترک کرنے کی عادت ڈالو۔ اور خدا تعالےٰ کے واسطے ان سب چیزوں کا چھوڑنا اگر ضرورت پڑے، توحید حقیقی ہے یہی لا الہ الا اللہ کی تفسیر ہے۔ اور یہی اسلام کا مقصد ہے۔ اور یہی وہ روح ہجرت ہے جس کے پیدا ہونے پر تم فقد فاز فوزاً عظیما کے مصداق بنو گے۔ اسی روح کے پیدا کرنے کے لئے ارکان اسلام کی تعلیم دی گئی یہی وہ چند روحانی مشقیں ہیں کہ جن کی ورزش تم کو کل منازل سلوک طے کرا کر تم میں وہ حقیقی روح پیدا کر دیگی۔ کلمۂ توحید ہم اس لئے پڑھتے ہیں۔ کہ ہم اپنے خیالات اپنے آرام اور اپنے محاکموں کو خدا تعالےٰ کے لئے ترک کر سکتے ہیں۔ اور سب مشرکوں سے بڑھکر وہ مشرک ہے۔ جس کا نام خود پرستی ہے ہم مرجاتے ہیں۔ لیکن اپنی رائے کو نہیں چھوڑتے اور یہ خودرائی دنیا میں ہمارے لئے صدہا مصائب کا موجب ہے اس بڑے

بت کو پاش پاش کرنے کے لئے ہم لا الٰہ الا اللہ پڑھتے ہیں۔ پانچ وقت
اذان سننے پر تم نے اپنے وقت اور اپنی کانوں کو خدا کے لئے چھوڑنا
سیکھا۔ ابھی رمضان شریف میں تم نے پورے تیس دن تک جائز تعلقات
زناشوئی۔ اکل و شرب کو خدا کے لئے بطیب خاطر چھوڑ دیا۔ جس شخص نے
روزے رکھے اور یہ سبق حاصل نہ کیا۔ یعنی اس میں یہ روح پیدا ہوئی
کہ وہ اکل و شرب اور تعلقات زناشوئی قومی اور ملی ضرورتوں کے لئے
چھوڑنا سیکھے۔ اس نے روزے نہیں رکھے۔ بلکہ فاقہ کئے۔ ہم زکوٰۃ صدقات
خیرات دے کر اپنے مال کو اپنے سے ترک کرنا سیکھتے ہیں۔ اب ہمارے
سامنے سلوک کی آخری منزل ہے۔ ہم حج کو نکلتے ہیں۔ گھر کو اہل و عیال
کو اور وطن کو خدا کے لئے ترک کرتے ہیں۔ کسی تجارت پر نہیں چلے۔ صرف
خدا کی خوشنودی کے واسطے ہم ان محبوبات کو چھوڑ رہے ہیں۔ عرب میں
داخل ہوتے ہی وہ شان و شکوہ کا نشان جس کے ذریعہ انسان کی
خواہ مخواہ عزت ہو جاتی ہے۔ یعنی لباس فاخرہ وہ بھی ہم وہاں جاکر
جسم سے علیحدہ کرتے ہیں۔ دو چادروں سے ہم اپنے جسم کو ڈھانک
لیتے ہیں، اور اس کا نام ہم نے احرام رکھا ہوا ہے اپنے پاس سے ضرورت
سے زیادہ مال و دولت بھی الگ کر دیتے ہیں۔ خدا کے گھر کے اردگرد
طواف کرتے ہیں۔ اور یہ کون نہیں جانتا کہ طواف کے بعد پندرہ بیس میل کے
فاصلہ پر میدان عرفات میں جاتے ہیں۔ وہاں زمین اور پتھروں پر سجدہ
کرتے ہیں اور لبیک کہکر یہ اظہار کرتے ہیں۔ کہ آج ہم نہ اپنے وقت

کے مالک ہیں نہ اپنی مال و دولت سے تعلق رکھتے ہیں۔ نہ اکل و شرب اور زوجیت کی ضروریات ہم پر اپنا اثر کر رہی ہیں۔ وطن اور اہل و عیال بھی تیرے نام پر چھوڑ چکے ہیں۔ اپنے جسم سے لباس بھی علیحدہ کر دیا ہے اور حرم میں آکر ان چیزوں کو تطییب خاطر اپنے اوپر حرام کر دیا۔ اس طرح ہر ایک ماسوا اللہ سے جدا ہو کر اور اپنی محبوبات تیری راہ میں چھوڑ کر لبیک لبیک لاشریک لک کہہ رہے ہیں۔ کاش دنیا اس عقیدہ سے آشنا ہوتی اور مسلم دنیا ان باتوں پر رسماً نہیں بلکہ حقیقتاً عامل ہوتی۔ اور ہر ایک حاجی مناسک حج کو اپنی عمل سے حقیقت کر دکھاتا۔ تو یہ مسلم قوم آج صاحب کیریکٹر کی مالک اور سیرت کی بادشاہ ہوتی۔ اور اس میں روح ہجرت پیدا ہو جاتی جس سے وہ ہر ایک چیز حاصل کر لیتے۔ اب میں ایک اور امر کی طرف آپ کو متوجہ کرتا ہوں۔ یہ ساری کی ساری چیزیں تو دنیا میں ہماری محبوب ہیں۔ اور ہماری کل سرگرمیوں کی محرک ہوتی ہیں۔ ان سب کا تعلق انسان کے اُس حصہ سے ہے جس کا نام بہیمیت ہے۔ انسان اور چارپائے میں بھی ایک امر مشترک ہے۔ ارکان اسلام کے پہلے چار رکن یعنی کلمہ طیبہ۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ بذات خود سب حج میں جمع ہو جاتے ہیں۔ گویا حج ایک مکمل راستہ سلوک کا ہے۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے اس کو سلوک کی آخری منزل کہا ہے۔ انہیں ایام میں ہم بہیمیت کے تقاضوں پر چھری پھیرنے کا سبق سیکھتے ہیں۔ کل مناسک حج ۹ کی شام کو ختم ہو جاتے ہیں۔ ۱۰ کو صبح ہوتے ہی ہم ایک چارپائے کے گلے پر چھری پھیر دیتے

ہیں۔ اس چار پائے میں جو کچھ ہے وہ وہی چیز ہے۔ جو انسان کے جسم میں آکر مختلف خواہشات پیدا کرتی ہے۔ ہم نے حج کے خاتمہ پر کسی جانور کو ذبح نہیں کیا۔ بلکہ بہیمیت کے گلے پر چھری پھیری۔ کس قدر نامراد وہ انسان ہے۔ جس نے ان قربانیوں کو گوشت خوری کا ایک ذریعہ سمجھا۔ اور اس نے بہائم کو ذبح کر کے بہیمیت کو اپنے سے علیحدہ نہیں کیا اگر مناسک حج کی حقیقت پر ہم عامل ہو جائیں۔ اور فی الواقع قربانی کے ساتھ اپنی بہیمیت کو بھی ذبح کر دیں تو آنحضرت صلعم کا یہ فرمانا صحیح ہو جاوے کہ جو حج کرتے ہیں۔ ان کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ الغرض لا الہ الا اللہ کہنا کوئی لفظی تکرار نہیں بلکہ اس امر کا اظہار ہے۔ کہ ہم اللہ تعالےٰ کے واسطے ہیں۔ میں نے اس خطبہ کے شروع میں کہا تھا کہ لا الہ الا اللہ کی بہترین تفسیر قل ان صلاتی ونسکی ...... الی آخرہ ہے +

اور یہ مقام اسی کو نصیب ہوتا ہے جو خواہش نفس یا بہیمیت کے کل تقاضوں کو اپنے سے جدا کر لیتا ہے۔ **ہجرت** جو کل فتوحات کی کنجی ہے۔ اور اسلام میں اس کو اس قدر اہمیت ہے۔ کہ ایک طرف ہمارے سن کا آغاز اور دوسری طرف ہماری فتوحات کی ابتدا اسی مبارک واقعہ سے ہوئی۔ جو ہجرت کرنی نہیں جانتا وہ لاکھ مسلمان ہو لیکن اس میں شان مومن ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ ہجرت سے مراد یہ نہیں کہ کسی جوش و غضب میں آکر اپنے مقام کو بدل لیا جائے۔ حقیقتہً ہجرت سے وہی آشنا ہے جس کے اندر روح ہجرت پیدا ہو چکی ہے۔ ہجرت کے معنے جدا ہونے کے ہیں

تم خدا کے راہ میں اپنے اکل و شرب اپنے تعلقات زناشوئی سے۔ پارچات سے لباس سے وطن سے املاک سے۔ اہل و عیال سے جدا ہونے کی اگر خدا اور قوم کی راہ میں ضرورت ہو تو طاقت پیدا کرو۔ اس طاقت کا نام روح ہجرت ہے۔ پھر تم اپنے وطن میں ایک مہاجر ہو۔

قول پیغمبر صلعم کے مطابق مہاجر وہی ہے جو ذنوب سے ہجرت کرنا جانتا ہے۔ اور ذنوب سے ہجرت وہی کر سکتا ہے۔ جو تقاضائے بہیمیت سے ہجرت کر سکتا ہے تم اپنے اندر روحِ ہجرت پیدا کرو۔ تم اپنے عمل سے دکھلاؤ کہ تمہیں قومی اور ملی مقاصد کے حصول میں مال۔ دولت۔ جاہ۔ خطابات۔ املاک۔ وطن۔ بیوی بچے کا جدا ہونا نہیں روک سکتا پھر تم فقد فاز فوزاً عظیماً کے مصداق بن جاؤ گے۔ ہاں مقاصد وہی ہوں جنکی اجازت قرآن دیتا ہے۔ ان کا محرک کوئی ایسا جذبہ نہ ہو۔ جسکی تہ میں نفسانیت یا وقت کے پالٹکس ہوں۔ یاد رکھو قرآن ایک جامع کتاب ہے۔ تمہارے پالٹکس وہی ہونے چاہئیے جن کی اجازت قرآن دے۔

توحید اور تمدن و تہذیب

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ توحید دنیا میں نہ صرف تہذیب و تکمیل نفوس کے لئے آئی بلکہ تکمیل تمدن بھی دنیا میں توحید سے ہی ہوئی اس کی تفصیل ہماری کتاب "قرآن و تہذیب و تمدن" میں آئیگی۔ یہاں ہم اسی قدر لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ جب انسان شرک کی مختلف زنجیروں میں جکڑا رہا وہ قوای کائنات سے پورے طور پر خدمت نہ لے سکا جس چیز کو ہم اپنا مخدوم یا خدا بنا ہیں ہم اسے اپنی خدمت میں نہیں لا سکتے اور کوئی خیر و برکت اس کے وجود میں ہمارے لئے پنہاں ہو اس سے ہم اسی حد تک مستفید ہونگے جہانتک وہ ہم پر احسان و مروت کر سکے۔ ہاں وہی وجود اگر ہماری خدمت کے لئے مقرر ہو جائے تو پھر کما حقہ اس کی ساری طاقتیں ہم اپنی خدمت میں استعمال کر لینگے تسخیر عناصر اور

ایسے ہی قوائے فطریہ جبتک ہمارے خدا بنے رہے
ان کی برکات ہم تک بطور عطیہ پہنچیں جس کے حصول
کے لئے ہم اُن کے آگے جھکتے اُن کی ناراضگی کی دفعیہ ہیں
ہم نے بعض وقت مختلف قسم کی قربانیاں کیں اُن کی نذر
دنیا نہ مانی گئی پھر بھی ہم پورے طور پر اُن کے مراحم وعنایات
کے مورد نہ بنے لیکن جس دن الہام ربانی نے ہمیں مقام توحید
پر کھڑا کر کے یہ سمجھا دیا کہ یہ ہمارے خدا نہیں بلکہ خداوند عالم
نے انہیں ہماری ہی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے تو اس مژدہ
کے پاتے ہی ہم اس فکر میں لگ گئے کہ کس طرح یہ ہمارے
خدام ہماری پوری خدمت کریں۔ اس گوہ نے ہمیں باب
تحقیق کے کھولنے پر آمادہ کیا۔ جس طرح کسی نوکر کو رکھکر ہم
کچھ عرصہ اس بات پر خرچ کرتے ہیں کہ ہم اس کی استعداد
وقابلیت کو دیکھکر اُسے اس کے موزون حال کام پر لگا دیں
اور اس طرح آہستہ آہستہ ہم اس سے پوری خدمت لینے کے
قابل ہوتے ہیں۔ ہو بہو وہی حال انسان، قوائی فطریہ کے

متعلق رہا جس دن. اُس نے عناصر پرستی چھوڑ کر یہ سمجھ لیا کہ عناصر اُس کے غلام ہیں وہ اُن کے خواص کے دریافت میں لگ گیا۔ اُس نے علوم جدیدہ کی بنا ڈالی جن کے ظاہر ہونے پر تمدّن نے دنیا میں تکمیل کی طرف قدم اُٹھایا +

نسل انسانی کے لئے وہ مبارک سے مبارک دن تھا جب اُس پر یہ راز کھُلا۔ اور یہ وہ دن تھا جس دن توحید کے معلم کامل علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے انسان کو یہ خوشخبری دی وسخر لکم مافی السمٰوات ومافی الارض جمیعا اے انسان جو کچھ بھی زمین و آسمان میں ہے وہ خدائے تعالےٰ نے تیرے لئے بنایا ہے اور اُنہیں تیرا مسخر کر دیا ہے۔ لفظ تسخیر بول کر یہ اشارہ کر دیا کہ تو اُن پر قابو پا سکتا ہے اور جس طرح تو چاہے اُن سے خدمت لے سکتا ہے۔ پھر آدمؑ کے قصہ میں سجدہ ملائکہ کا ذکر کر کے نہ صرف یہ سمجھا دیا کہ انسان قوائے فطریہ کو حرکت میں لانے والے ملائکہ کا مسجود ہی ہے بلکہ اس شرط کا بھی ذکر کر دیا جس کے پورا ہونے پر ہی قوائے

فطرتی کسی انسان کی اطاعت کرینگے۔ خدا یتعالےٰ نے آدم کو کل اشیاء کے اسماء بتائے۔ اُسے خواص الاشیاء سے اطلاع دی کیونکہ حقیقت اسم شئے دراصل حقیقت خواص شئے ہوتی ہے۔ ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے انجیل توریت کے مقابل قرآن میں کیا چیز دیکھی۔ اس کا جواب ہماری طرف سے یہی ہوتا ہے کہ ہم نے طوطا کہانی کے مقابل داستان علم وحکمت کو سنا۔ قصہ آدم مندرجہ توریت کو پڑھکر انسان کو اگر بے ایمان نہ ہوتا ہو تب بھی وہ ہوجاتا ہے۔ وہاں آدم کو درخت علم کے پاس جانے سے خدا روکتا ہے اور اُس کے میوہ علم کے چکھنے پر اُسے بہشت سے خارج کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ اس خدا کی ہمارے دل میں کیا عزت ہوسکتی ہے جو ہمیں کھانے پینے کی تو سب چیزیں دے اور اس طرح جذبات حیوانی کی تسکین کے سارے ہی سامان رکھدے پھل پھول میوہ۔ اجناس سب باغ عدن میں رکھدیئے پھر ان لذائذ جسمانی کی تکمیل کے لئے ایک عورت بھی پیدا کرے

عورت کی پیدائش کی وجہ بھی توریت نے یہ ہی بیان کی ہے کہ آدم کی راحت کی تکمیل ہو۔ گویا بہیمیت کے سارے تقاضے تو پورے کر دے لیکن اُس جوہر کی آبیاری کو روک دے جو انسان اور حیوان میں ما بہ الامتیاز ہے یعنی جوہر عقل۔ اس کا بیج تو اب علم سے ہی ثمر ہوتا ہے۔ لیکن آدم کو حکم ہوتا ہے کہ جو چاہو کھاؤ جو چاہو کرو لیکن درخت علم کے قریب مت جاؤ آخر اس خدا کا اس سارے کھیل سے مطلب کیا ہے ہمیں جاہل رکھنے میں اُس کا نفع کیا ہے۔ لیکن مصنف بائیبل کا بھلا ہو اس نے اس نکتہ معرفت سے بھی ہمیں اطلاع دیدی ہے۔ وہاں کہا ہے کہ آدم کے میوۂ درخت علم کھانے پر خداوند نے فرشتوں کو جمع کیا۔ اور اُنہیں کہا کہ آدم درخت علم کا پھل کھا کر اب درخت حیات ابدی سے واقف ہو جائیگا۔ اور اگر وہ کھا گیا تو ہماری طرح حیات ابدی پالیگا۔ پھر کیا تھا مصلحت اسی میں دیکھی گئی کہ ابو البشر وہاں سے رخصت کئے جائیں۔ بات تو سچ ہے کہ حیات ابدی بھی عرفاں سے ہی

حاصل ہوتی ہے ۔لیکن ہم اُس خدا کو کیا کہیں جو اس طرح گھبرا رہا ہے ۔جس کا حسد انسان کو ابدی حیات کے مقابل ابدی ہلاکت دینے لگا ہے ۔ہم حیران ہیں کہ ان باتوں کو ہم علم الٰہیات کہیں یا چڑے چڑیا کی کہانی ۔ ابدی ہلاکت کے پانے کی داستان جس وقعت سے دیکھی جاسکتی ہے اُسی وقعت سے انسان اس دوسری داستان کو دیکھتا ہے جس میں انسان کو ابدی ہلاکت سے ابدی حیات کا وارث بنایا جاتا ہے ۔ نہ معلوم علم وحکمت کی ڈگریاں جو مغربی یونیورسٹیوں میں ملتی ہیں ۔ اگر وہ علم وعقل کا نشان ہے ۔تو وہ علم وعقل ان معاملات کے سمجھنے میں کیوں زنگ آلود ہو جاتا ہے ۔اگر آدم نے درخت علم کھا کر ہمیں ابدی ہلاکت میں ڈالا اور اسکی وجہ بائیبل یہی بتاتی ہے کہ خدا آدم اور اس کی اولاد کو حیات ابدی سے الگ رکھنا چاہتا تھا تو پھر کفارہ کی کیا ضرورت تھی ۔کیونکہ ابن آدم نے مصلوب ہو کر ہمیں حیات ابدی ہی دلائی ۔اس کو تو خدا ہمیں دینا نہ چاہتا تھا ۔خدا نے جو

نہیں درخت علم سے روکا تھا تو اس لئے کہ کہیں ہم حیات ابدی حاصل نہ کر لیں۔

نادان انسان کیوں یہ نہیں سمجھتا کہ کوئی فعل فی نفسہ گناہ نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ کسی فعل کا فعل جائز یا گناہ بننا نتائج پر منحصر ہوتا ہے۔ نتائج و نیات ہی اس امر کا فیصلہ کرتی ہیں کہ فلاں امر صحیح ہے یا گناہ اب اگر یہ بات صحیح ہے تو درخت علم کا پھل کھانا فی نفسہ برا نہ تھا بلکہ اس کا جو نتیجہ ہونا تھا اُس سے یہ گناہ ہو گیا اور وہ یہ تھا کہ آدم اب نخل حیات ابدی سے بھی واقف ہو جائیگا جس کا پھل کھا کر وہ حیات ابدی کا وارث بن جائیگا۔ جس امر کے اُس وقت حاصل ہونے پر خدا کا غضب بھڑکا وہی ہمیں پھر کیوں عطا ہو۔ یعنی مسیح کے کفارہ کے ذریعہ کہا جاتا ہے کہ ہم حیات ابدی کے پھر وارث ہوں۔ کیا یہ اجتماع ضدین نہیں۔ توریت تو ممنوع پھل کے کھانے اور حیات ابدی پانے کو لازم ملزوم ٹھیراتی ہے۔ یعنی ممنوع پھل کے کھانے کے بعد ہم نے ثمر درخت حیات ابدی کھا کر حیات

ابدی پانی تھی۔ اس ثمر سے انسان کو متمتع ہونے سے روکنے
کے لئے خدا نے بہشت سے آدم کو نکالا۔ لیکن کلیسہ پھل کھانیکا
ثمرہ ہلاکت ابدی ٹھیرلتے ہیں۔ یہ ایک عجیب منطق ہے اس
ساری داستان کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ ایک متلون
اور حاسد ہستی ہے۔ حیات ابدی تو آدم پھل کھا کر حاصل
کرہی سکتا تھا۔ پھر اس وقت اس ناراضگی کے کیا معنی جب
آخر ہیں وہی چیز دینی تھی۔ یا بالفاظ دیگر اگر واقعہ مصلوبیت
کے بعد حیات ابدی ہی دینی تھی تو پھر درخت علم کھانے
سے کیوں روکا گیا جس سے خودبخود حیات ابدی مل جاتی
کیا یہی صفات الہیہ کا نیا انکشاف ہے جسپر کلیسہ کو ناز ہے
جس کا نام نیوابی فینی ہے۔ قرآن کی طرف جب ہم آتے ہیں
تو اسی قصۂ آدم کو ہم علم و حکمت کی جان پاتے ہیں۔ اس ہیں
ہمیں اپنی استعدادوں سے اطلاع دی گئی ہے۔ ہم میں اور
باقی کائنات میں جو رشتہ ہے وہ بتلایا جاتا ہے۔ پھر ہمیں
مقام لغزش سے اطلاع دیدی جاتی ہے۔ یعنی انسان کو

اطلاع دیجاتی ہے کہ تو زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ زمین پر اور
آسمان پر تیری آسائش و راحت کی سب چیزیں موجود ہیں۔
ان چیزوں کا فائدہ رسان ہونا قوائے فطریہ کے چلانیوالوں
کے ہاتھ میں ہے اُن کو اپنی اطاعت میں لانے سے وہ سب
چیزیں جو تیری ہی آسائش کے لئے زمین و آسمان میں رکھی
گئی ہیں تیری خدمت میں لگ جائینگی۔ ہاں۔ اُن وجودوں
کی اطاعت حصول علم پر منحصر ہے۔ فعلم ادم الاسماء کلھا
کے ظہور پر ہی ملائکہ سجدہ میں گر جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر
قوت فطری جو انسان کے اندر بطور تخم موجود ہے وہ بھی علم کی
ہی آبیاری سے باثمر شجر بن جاتی ہے لیکن اس قوت کا نمو اگر
غلط طریق پر ہو جائے جو جہالت کا لازمہ ہے تو پھر جو شجر خبیثہ
وہ بنینگی وہ فی نفسہٖ دوزخ ہے۔ اس لئے قویٰ کی اس
قسم کے نمو یا شجر سے انسان کو روکا گیا۔ اور لا تقربا ھٰذہ
الشجرۃ کا حکم ہوا +

اب یہ قصہ آدم کیا ہے۔ ایک طرف انسانی فطرت اور

دوسری طرف قوائے کائنات کا تذکرہ ہے۔ انسان کو یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ وہ کس طرح کا حاکم ہو سکتا ہے۔ اور اسے اس کی راہ میں لغزش سے بھی اطلاع دیدی گئی۔

الغرض قرآن نے نازل ہوکر دنیا کو یہ خوشخبری دی۔ کہ جنہیں تم خدا سمجھے ہوئے ہو وہ تمہارے خدا نہیں تمہارے غلام ہیں۔ بلکہ تم نے ان قوائے فطریہ کے علاوہ ان قوائے کے حرکت میں لانیوالوں کو بھی خدا بنا رکھا ہے۔ ہم نے تمہیں ان کا بھی مسجود و متبوع بنایا ہوا ہے۔ قرآن نے نہ صرف اس قدر کہا بلکہ اسلام سے پہلے کائنات کی جس جس چیز کو انسان نے خدا بنا رکھا تھا۔ ان سب کو ایک ایک کرکے گنا اور ان سب پر فتوی غلامی دیا۔

وسخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ ج وسخر لکم الانھر ج وسخر لکم الشمس والقمر دائبین ج وسخر لکم الیل والنھار ج وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا یعنی جو کچھ بھی زمین و آسمان میں موجود ہے

چاند سورج ستارے دن رات بادل بارش۔ ہوا۔ پانی سمندر اور اس پر جہاز چلنے والا یہ سب اللہ تعالےٰ نے انسان کے حکم کے بندے کر دیئے ہیں جس چیز کی ضرورت ہو وہ ان سے خدمت لے کر حاصل ہو سکتی ہے +

کیا جو انسان ان چیزوں کو خدا سمجھے اس میں یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ان کو اپنا خادم بنائے۔ خادم بنانا تو درکنار ان کے متعلق ایسا وہم کرنا بھی گناہ کبیرہ ہو گا۔ پھر وہ کونسی چیز ہو گی جو انسان کو ان پر مسلط ہونیکی تحریک کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان پر تسلط کا خیال ہی ہمیں ان کے حقائق کے دریافت کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس لئے کیا قرآن سے بڑھ کر کسی دنیا کی کتاب نے کسی مذہب نے کسی تعلیم نے انسان پر اتنا احسان کیا۔ اگر آجکل کی یہ سب تمدن و تہذیب اور ہمارے آسائش و راحت کے سامان علوم جدیدہ کی دریافت و تکمیل سے وابستہ ہیں۔ تو اس دریافت کی طرف انسان اسی دن متوجہ ہو سکتا ہے۔ جب انسان

نہ صرف ان کی پرستش سے نکلے بلکہ ان کو اپنا غلام بھی سمجھے
تم اگر جل (پانی) دیوتا کی پرستش کرتے ہو تو پانی کی برکات
سے فائدہ اٹھانے کے لئے تم وہ راہیں اختیار کرو جس سے
وہ دیوتا خوش ہو جائے۔ تم جل دیوتا کی ستائش میں وید کے
منتر گاؤ گے۔ ان کو خوش کرنے کے لئے کوئی "یگ" کرو گے
اس پر بھی وہ تمہیں اپنی برکات سے متمتع ہونے دے یا نہ
دے۔ چنانچہ جل مہاراج نے تمہاری پیاس بجھانے یا
تمہاری کھیتوں کو آبیاری کرنے کے سوا تمہیں اپنی
کسی اور برکت سے کبھی مستفید نہ کیا۔ لیکن جس دن معلم توحید
نے آکر تمہیں اطلاع دیدی کہ وہ تو تمہارا غلام ہے اور تمہیں
اُس پر مسلط ہونے کا راز بھی بتلا دیا۔ تمہیں ہدایت کی کہ
تم پانی کے خواص دریافت کرو۔ اور اس طرح اس پر حکومت
کرو۔ پھر دیکھ لو یہی پانی کس طرح اور کس کس شکل میں تمہارے
لئے خیر و برکت کا موجب ہو گیا۔

یہ باتیں ہیں نظریہ کے رنگ میں ہی نہیں کہتا بلکہ واقعات

عالم نے میرے ان دلائل پر مہر صداقت ثبت کی ہوئی ہے
اسلام سے پہلے انسان کو نظری علوم سے ہی تعلق رہا۔
مادیات کے متعلق اس کا علم محدود تھا چنانچہ علوم متعلقہ
مادیات کا نام علوم جدیدہ رکھنا ہی اسی بات کی طرف
اشارہ کرتا ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ علوم جدیدہ کی بنیاد سب
سے اول مسلمانوں نے ڈالی۔ وہ مادیات کی ہر ایک شئے کو
کم و بیش تحقیق میں لائے۔ الغرض علوم جدیدہ کی شاہراہیں
مسلمانوں نے کھولیں جن پر بعد میں مغربی قومیں چلیں۔ ان
مغربی اقوام کے بعد پھر جو ان رازوں سے واقف ہو گئے
وہ چلے۔ بہر حال یہ سب توحید کے کرشمے ہیں +

ان باتوں کا کما حقہ سمجھ لینا کہ تمدن و تہذیب کہانتک
ایمان بالتوحید کی مرہون ہے کس قدر باریک نگاہ کو چاہتا
ہے لیکن ایک سطحی نظر سے بھی دیکھا جائے تو آسانی سے
انسان سمجھ سکتا ہے کہ توحید دنیا میں پیدا ہو کر کس طرح انسان
کو تمام قسم کے مصائب سے بچا لیتی ہے۔ اسی ملک ہندوستان

ہیں مختلف امراض بعض دیوی دیوتاؤں کے ظہور یا اُن کی
ناراضگی کا نشان سمجھے گئے ہیں۔ اس لئے ان امراض کا دفعیہ
ان رب الامراض کی خوشنودی مزاج سے وابستہ کر دیا گیا ہے
چنانچہ آج سے کچھ سال پہلے چیچک کا علاج سیتلا دیوی کی
پرستش چاہتا تھا۔ وہ جس گدھے پر سوار ہو کر کسی گھر میں آتی
ہے اُس کے لئے چنے تیار کئے جاتے تھے۔ وہ کسی گدھے
کو کھلانے سے سیتلا کے گدھے کو سیر کر دیتے تھے۔ بعض چیزوں
سے اُسے محبت بھی تھی۔ اور اُن چیزوں کا علم ہمیں براہمن
دیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ چیزیں کچھ تو برہمن لے جاتے تھے
اور کچھ چیچک زدہ کو کھلائی جاتی تھیں۔ یہ بھی ہماری خوش قسمتی
تھی کہ جو چیزیں مرغوب سیتلا مریض کے حصہ میں آتی تھیں
اُن میں سے بعض دفعہ چیچک کے لئے بذات خود مفید تھیں
مثلاً اُردر اس کا دانہ سونہ منقی وغیرہ اس طرح چیچک کے
پیدا ہونے پر ہم سیتلا کی پرستش کے یہ سامان مہیا کر دیتے
تھے وہ دراصل بچوں کو اپنے یہاں لے جانے کے لئے آتی

تھی۔ اگر ہمارے منتر غالب آ گئے تو باکراہ اُسے چیچک زدہ بچہ چھوڑنا ہی پڑتا تھا۔ اور اس حالت میں وہ اپنی ناراضگی کا نشان کچھ نہ کچھ بچہ کے جسم پر چھوڑ جاتی تھی والا بچوں کو اپنے ہمراہ لے جاتی تھی۔ لیکن توحید نے آ کر اتنا تو کیا کہ سیتلا کی حکومت بہت حد تک کم کر دی۔ اور ہندوستان کے ہزاروں بچوں کو بچا لیا۔ آج بھی ٹیکہ لگانے کی مخالفت اُن ہی گھروں میں ہوتی ہے جہاں سیتلا دیوی کی حکومت ہے۔ یہی حال دیگر امراض کا ہے۔ اب ایک انسان سمجھ سکتا ہے کہ شرک نہ صرف مخرب اخلاق ہی ہوتا ہے بلکہ اس کا وجود کن کن صورتوں میں مفاد انسانی کو تباہ کرتا ہے۔ امراض کے معاملہ میں کمال توحید اس وقت انسان میں پیدا ہو گا جس دن وہ سمجھ لیگا کہ مجھے امراض پر تسلط اور حکومت ہے یعنی ایک طرف اُن اسباب سے آگاہ ہو جائیگا جن کے پیدا ہونے پر مختلف امراض پیدا ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف وہ اُن معالجات کو بھی دریافت کریگا جن سے وہ

اسباب رفع ہو سکتے ہیں۔ اس علم کے حاصل ہونے پر وہ ان مخفی قوتوں پر مسلط ہو جائیگا جن سے امراض پیدا یا گم ہوتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ملکوت امراض کا مسجود ہو جائیگا

بعض نادان یہ کہدیا کرتے ہیں کہ توحید کا مسئلہ اتنا مشکل ہی کیا تھا۔ کہ جس کے سمجھانے کے لئے خدا تعالےٰ نے انبیاء کی نسل کو پیدا کیا۔ خدا کا ایک سمجھ لینا کونسی بڑی بات ہے کہ جس کے لئے مسلمان اس قدر زور دیتے ہیں۔ بالمقابل دہریت اور تشکک کے مرہون یہ کہا کرتے ہیں کہ خود خدا کو ہی کونسی ضرورت پڑی ہے کہ اپنے آپ کو ایک منوانے کی تکلیف اٹھائے۔ ان سوالات کے جواب میں جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے وہ ایک حد تک کافی ہے ایک غور کرنیوالا انسان غور کر سکتا ہے کہ خدا کو ایک نہ ماننے نے انسان کو کس قدر نقصان پہنچایا اور پھر حقیقت توحید پر قائم ہونے سے انسان کن کن کمالات کا وارث ہو گیا۔ تمدن و تہذیب جس کا نام ہے وہ خاص قسم کے کپڑے پہننا یا خاص قسم کی طرز رہائش اختیار کرنا

نہیں حقیقت تہذیب و تمدن کے سمجھانے کے لئے
قرآن کریم نے ایک لفظ فلاح بولا ہے بلکہ یہانتک کہا ہے
کہ نزول الہام کی غرض و غایت اُن راہوں کی ہدایت کرنا
ہے کہ جن پر چل کر انسان صاحب فلاح ہو جائے۔ فلاح کے
معنی کسی چیز کے مخفی قوی کا نشوونما پا جانا ہے۔ یہی اس
لفظ کے اصلی معنی ہیں اس کے دوسرے معنی اگر کامیابی ہیں
تو اس لئے کہ کسی چیز کی کامیابی اسی میں ہوتی ہے کہ اس کے
اندرونی جوہر ظاہر ہو جائیں۔ کسی چیز کی حد استعداد اس کی
کامیابی ہوتی ہے۔ الغرض انسانی تعلقات کے لحاظ سے
فلاح کے معنے یہ ہیں کہ ایک طرف جو جو استعدادیں انسان
میں ہیں وہ تا بحد کمال ظاہر ہو جائیں۔ دوسری طرف کائنات
کی ساری استعدادیں جو انسانی مفاد میں آسکتی ہیں وہ کل کی
کی کل ہماری خدمت میں کام کرنے لگ جائیں۔ تمدن و
تہذیب انسانی کی اگر کوئی جامع مانع تعریف ہو سکتی ہے
تو یہی ہے جو میں نے ان دو لفظوں میں کر دی ہے اس کا نام

قرآن نے فلاح رکھا ہے۔ اور جس کی رو سے قرآنی لفظ فلاح اور تمدن و تہذیب مترادف ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کا صحیح اور کامل نقش اس وقت تک کسی مغربی دماغ پر روشن طریق سے مرتسم نہیں ہوا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ مسئلہ توحید ان دو امور کے حصول کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ اور حقیقت توحید سے آشنا ہونا کہاں تک ہمارے تمدن و تہذیب کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے قرآن کا ایک طرف یہ کہنا کہ دنیا میں مذہب حقیقت توحید سمجھانے آیا اور دوسری طرف یہ تعلیم دینا کہ الہام دنیا میں فلاح کے لئے آیا۔ یہ دراصل ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں گویا علت و معلول کو یا اسباب و نتائج کو الگ الگ بتلایا ہے۔ اگر مذہب کی غائت فلاح بتلائی گئی تو دراصل یہ کہا گیا ہے کہ مذہب کے ماتحت آکر انسان فلاح کو پا سکتا ہے اور اگر مقصد مذہب سبق توحید بتلایا گیا تو اس سے مراد وہ اسباب تھے جن سے فلاح پیدا ہوتی تھی۔ گویا ایمان بر توحید ایک تخم ہے جس کے ثمرات فلاح ہیں اگر مذہب کی غرض و غایت

فلاح نہیں تو پھر انسان کو مذہب کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اگر یہی غرض وغائت ہے اور توحید کا سبق ہمیں اسی لیے دیا گیا ہے تو پھر اس مقصد کو جس طرح قرآن نے پورا کیا ویسے دنیا کی کس کتاب نے یہ حق ادا کیا ہ خدا کو ایک ماننا تو سب بتلاتے ہیں لیکن قرآن کے سوا ہمیں اور کوئی نہیں بتلاتا کہ ہم اپنے معبود کو کیوں ایک مانیں اور اگر اس کے ایک ماننے سے کوئی فایدہ ہے تو وہ کس طرح مرتب ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان اوراق کا پڑھنے والا غرض وغایت تعلیم توحید سے آشنا ہو جائے گا اور قرآن کے آگے سر جھکا دیگا۔ قرآن نے ایک مسئلہ توحید کو ہی انسان کے سامنے رکھا۔ اور اس کو مختلف پہلوؤں میں پیش کر کے نہ صرف انسان کو اس قابل بنانا چاہا کہ وہ اس دنیا کی فلاح حاصل کرے بلکہ اس کے قوی تہذیب وتعدیل پاکر دائمی ثمرات سے بارور ہوں +

اس بحث میں جہانتک انسانی اخلاق کا تعلق ہے میں چند سطریں یہاں اور لکھنی چاہتا ہوں۔ میرے مخاطب علی الخصوص

مسلمان ہیں۔ وہ یہی سمجھ کر خوش نہ ہو جائیں کہ ان اوراق کا مصنف مخالفین مذہب کے مقابل ایک جدید علم کلام تیار کر رہا ہے۔ یہ قوم کی بدقسمتی ہے کہ جب کبھی ہم نے فضایل اسلام پر قلم اٹھایا ہمارے مسلم قارئین ایسی تحریروں کو پڑھکر اس لئے خوش ہو گئے کہ یہ شخص ہمارے فضائل بیان کر رہا ہے لیکن ان لوگوں نے ایک منٹ کے لئے نہ سوچا کہ خود ان میں وہ فضائل ہیں یا نہیں۔ مسلمان پرستش ماضی میں مر گئے ان میں کے جو کسی قدر بہتر تھے وہ تفاخر حال میں پڑے رہے لیکن اُن کو سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ دنیا میں وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے۔ جس کا ایمان مستقبل پر ہو۔ لیکن جس کی نگاہ گذشتہ کل پر ہو یا وہ خوبصورتی ماسبق کا متوالا ہو رہا ہو یا آج کی خوشحالی پر خوش ہو بیٹھا ہو یہ دونوں خسران میں ہیں۔ مبارک وہ ہے جو آنے والے کل پر ایمان رکھے اور اس کی بہتری کا فکر کرے وبالاخرۃ ھم یوقنون کی رمز کو سمجھے۔ قرآن کریم نے تمہاری ایمانیات کی فہرست بھی دی ہے۔ لیکن جہاں کہیں

مختصر سے مختصر الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ وہاں دو چیزیں ضرور ذکر کر دی ہیں۔ ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ یوم آخر پر ایمان اور اس کو پیش نظر رکھنا ہمارے ایمان کی کس قدر زبردست جزو ہے۔ یوم کے معنے عربی میں وسیع ہیں۔ وقت کے کسی حصہ کو بھی یوم کہہ سکتے ہیں۔ ایک مقدار وقت کا نام دراصل یوم ہے۔ اس لئے ہر لحہ جو دوسرے لمحہ کے بعد آتا ہے یا ہر پیچھے آنے والی ساعت وہ دن ہفتہ مہینہ یا برس۔ صدی اور ایسا ہی آئندہ جہان یعنی یوم قیامت یہ سب کے سب یوم آخر ہیں۔ اس حقیقت سے آشنا ہو جاؤ اور کل کا فکر کرو۔ پدرم سلطان بود کے گیت گانے چھوڑ دو۔ میری تحریروں میں اگر تمہیں دوسرے مذاہب پر کوئی اسلامی فضیلت یا خوبی نظر آئے تو لللہ یہ فرض نہ کر لو کہ وہ تم میں موجود ہے بلکہ ہمارے لئے یہ رونے کا مقام ہے کہ ان فضائل کے ہونے سے ہی ہمارے سلف دنیا پر مسلط ہو گئے ان کے نہ ہونے پر ہم مقہور زمانہ ہو گئے۔ ہاں ان کے پھر پیدا ہو جانے

سے ہم گئی گذری عزت کو حاصل کر لینگے ۔اس لئے یوم ماضی پر ایمان لانا چھوڑ کر یوم آخر پر عملاً ایمان لاؤ +

ایمان بالتوحید جس طرح موجب تہذیب اخلاق و روحانیات ہو جاتا ہے ۔اس کے سمجھنے کے لئے مسئلہ اسمائے الٰہیہ کی حقیقت سے واقف ہونا ضروری ہے دنیا نے صفات الٰہیہ کے سمجھنے میں بڑی بڑی غلطیاں کیں اسی کے غلط مفہوم نے غلط عقاید ۔اور غلط معیار اخلاق ۔پیدا کر کے مختلف اقوام کے تہذیب و تمدن میں ایک انقلاب و اختلاف عظیم پیدا کر رکھا ہے ۔یہ سب مذاہب مختلفہ دراصل اس اختلاف تعلیم کا نتیجہ ہیں ۔جو اسمائے الٰہیہ کے متعلق مختلف مذہب میں موجود ہے +

قرآن کریم نے اسماء الٰہیہ کا نہایت ہی عجیب و غریب اور دلچسپ نظام باندھا ہے ۔اسماء سے ہماری مراد صفات الٰہیہ ہے ۔حقیقت اسماء بھی دراصل صفات ہوتی ہیں ۔اشیاء کے جو نام ہم تجویز کرتے ہیں ۔وہ تعبیری ہوتے ہیں لیکن ان ناموں سے ہمارا مفہوم اس چیز کی صفات مختصہ ہوتی ہیں ۔کسی انسان کے

نام لینے پر بھی ہمارے خیال میں اُس کے خط و خال اُس کی چال ڈھال ۔ اُس کی صفات و اخلاق معلوم ہی آتے ہیں قرآن کریم نے اللہ تعالےٰ کے ننانوے اسمار بیان فرمائے ہیں پھر اُن کو اسمائے تحمیدیہ اور تنزیہیہ میں تقسیم کیا ہے۔ اول الذکر ان جمیع صفات حسنہ کا ذکر کرتے ہیں جو ذات باری نے بہترین رنگ میں اپنے اندر جمع کی ہیں۔ بالمقابل اسمار تنزیہیہ اُن امور کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن سے خدا تعالےٰ کی ذات منزہ و پاک ہے انسان کی تکمیل نفس بھی ان ہی اسماء کے سایہ ہی میں ہوتی ہے۔ وہ بھی جب ان اسمار کا رنگ اپنے اندر پیدا کر لیگا تو اخلاق کے کمال پر پہنچکر روحانی دنیا میں آجائے گا اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کریم نے سب سے اول خدا کی ذات کو انسان کے سامنے رکھکر اس کے صفات عالیہ کو اس کا نمونہ بنایا ہے۔ یعنے جو جو صفات اسمائے تحمیدیہ میں پائی جاتی ہیں۔ اُنہیں انسان نے حتی الوسع اپنے اندر پیدا کرنا ہے۔ اور اُن باتوں سے اپنے آپ کو پاک کرنا ہے جن سے

ذات باری کو صفات تنزیہی منزہ کرتی ہیں۔ اسی اصول پر قرآن نے ان اعمال حسنات کو خیرات کر کے پکارا ہے جو اسماء حسنہ کی منشاء کو پورا کرتے ہیں۔ اس کے بالمقابل ان ہی اسماء کی منشاء کے خلاف راہوں پر چلنے کا نام گناہ۔ بدی۔ اثم۔ عدوان۔ معصیت جرم ذنوب وغیرہ وغیرہ تجویز ہوا ہے۔ اس عظیم الشان حقیقت کو قرآن نے ان مختصر الفاظ میں کھول دیا ہے۔ وللہ الاسماء الحسنی فادعوہ بہا وذروالذین یلحدون فی اسمائہ سیجزون ما کانوا یعملون۔ اسمائے حسنیٰ صرف اللہ ہی کے ہیں۔ خدا کو انہیں ناموں سے بلاؤ۔ ان لوگوں سے تعلق نہ رکھو جو ان اسماء سے انحراف کرتے ہیں وہ اپنے کئے کی جزا پالینگے) کیا مختصر الفاظ ہیں۔ مگر ہر ایک خیر و برکت کے حصول کی راہ بتلا رہے ہیں اس ایک آیت پر ایمان و عمل کل منازل سلوک کو طے کرا دیتا ہے۔ تمدن۔ تہذیب۔ اخلاق۔ روحانیات فی الجملہ تکمیل نفس کا کل راز اس ایک آیت میں رکھ دیا گیا ہے +

تم کسی شخص یا کسی چیز کو کسی مقام پر اسی وقت بلا یا لا سکتے ہو
جب وہ مقام اس کے مناسب حال ہو۔ اور اس کے خلاف
طبیعت وہاں کوئی چیز نہ ہو۔ سیماب۔ آتشین مقامات پر
ٹھہر نہیں سکتا۔ یا وہ قایم النار اسی وقت ہوگا جب وہ اپنی
طبیعت کو بدل ڈالے۔ آگ اور پارہ اسی جگہ جمع ہو سکتے ہیں
جہاں دونوں میں سے ایک اپنی بعض طبعی خواص کو چھوڑ دے
ایک عطار۔ بدبودار اور متعفن جگہوں میں ٹھہر نہیں سکتا۔
اگر یہ صحیح قضایا ہیں تو پھر ایک ظالم طبع انسان خدائے رحیم کو اور
ایک ناپاک دل خدائے قدوس کو اپنی طرف نہیں بلا سکتا۔ اگر
وہ اپنی حالت کی مناسب محل تبدیلی کے بغیر کسی نام کو پکار رہا
ہے تو وہ اصل راہ کو گم کئے ہوئے ہے۔ ایسے شخص کے متعلق
خود قرآن فرماتا ہے۔ وما دعاء الکافرین الا فی ضلال

دعاء بالاسماء الحسنیٰ میں داعی کے پہلے قدم کے لئے

اس کی اپنی تبدیلی حالت کا ہونا شرط ہے۔ خدا کو کسی نام سے
پکارنے کے وقت اگر انسان کی حالت اس اسم پاک کے

مناسب حال ہو یعنی اس اسم پاک کے متقاضی امور اُس میں ہوں اور اُس کے منافی حالات سے اُسے قطعی اجتناب ہو۔ تو ممکن نہیں کہ درِ مقبولیت اُس انسان پر نہ کُھل جائے۔ دعا بالاسماء الحسنیٰ اور الحاد فی اسماءہٖ کی حقیقت بھی یہی ہے یعنی کسی اسم صفتی کے مطابق حال ہو جانا دعاء بالاسم ہے۔ اُس سے انحراف الحاد فی اسم۔ حمد و تسبیح کی غرض بھی یہی تھی۔ اس سے مراد وہ سبحہ شماری نہ تھی جو بعض یہود و نصاریٰ مسلمان ہو کر ہم میں لے آئے۔ اور وہ بات جو کنھلک کلیسیوں اور اسرائیلی صومعوں میں بیٹھنے والوں کا آج بھی زیور ہے۔ وہی دانہ شماری ہماری مسجدوں اور خانقاہوں کی زیب و زینت ہوگئی ہے۔ ذکر و فکر اسمائے الٰہیہ تو بزرگوں نے حسب تعلیم قرآن کسی مقصد اعلےٰ کے حاصل کرنے کے لئے تجویز کئے تھے جیسے انشاء اللہ ہم آگے چلکر بیان کرینگے۔ وہ مقصد تو جاتا رہا۔ اور ہمارے ہاتھ میں تسبیح کے دانے رہ گئے۔ یہاں اسی قدر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ اگر تسبیح سے مراد خدا کی پاکیزگی بیان کرنا اور حمد سے مراد

اس کی حمد و ستائش کے الفاظ دہراتے ہیں تو یہ دانہ شماری
لاحاصل ہے۔ کیونکہ خدا کا نام ایک طرف حمید ہے اور
دوسری طرف وہ سبحان ہے۔ حمد اور پاکیزگی اس کے ذاتی
جوہر ہیں۔ اور اگر اس نام شماری سے کوئی یہ سمجھ رہا ہے
کہ صرف اتنی دفعہ نام لینے سے بذات خود اس میں بھی کوئی
خیر و خوبی پیدا ہو جائیگی تو پھر دانہائے تسبیح کی بجائے اگر
ہم مسلمان تبت کے لاموں سے یا چین سے چرخ عبادت
منگوالیں تو بہت وقت بچ جائیگا۔ ان چرخوں پر حسب
تعلیم مذہب لامہ بعض مقدس نام لکھے ہوتے ہیں۔ ان کے
ایک پھیر میں ہزارہا یا دو ہزارہ دفعہ اسم مقدس کی گنتی ہو جاتی
ہے اس مذہب کا پابند چلتا پھرتا اٹھتا بیٹھتا دن میں کئی دفعہ
ان چرخوں کو حرکت دیدیا کرتا ہے۔ اگر حمد و تسبیح سے مراد وہ
تفکر و عمل نہیں کہ جن سے ہم میں اسمائے تحمیدیہ کا رنگ پیدا
ہو جائے اور اسمائے تنزیہیہ ہمیں عیوب متعلقہ سے منزہ
کردیں۔ تو پھر اقتصاد عمل تو اسی بات کی سفارش کرتی ہے

کہ ہم اپنی عبادات میں تسبیحوں کی بجائے چینی چرخہ داخل کریں۔ یہ دانہائے تسبیح بھی تو شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمارے ہاتھ میں نہیں دیئے۔ جب یہ آلہ اسم شماری ہم نے اوروں یعنی یہود۔ نصاریٰ۔ اور برہمنوں سے لیا ہے۔ تو اب دوسرا آلہ اسم شماری اگر چینیوں سے لے لیں تو کیا مضائقہ ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ط

اب میں پھر اصل بحث کی طرف آتا ہوں۔ قرآن نے صرف ایک ذات خداوندی کو انسان کا نصب العین بنایا ہے۔ وہی اس کا مرجع اور وہی اس کا مطلوب متبوع ہے چنانچہ لا الہ الا اللہ کی تفسیر میں مقدس معلم نے لا مقصود لی ولا متبوع لی الا اللہ فرمایا ہے۔ اس مقام توحید پر قرآن نے انسان کو قائم کرنے کے لئے جیسے کہ اوپر بیان ہوا کل اپنی تعلیم کو ایک اللہ کے لفظ سے وابستہ کر دیا۔ اس اسم ذات کی ننانوے صفات بیان کر کے ان کے تطابق اور تخالف کو حسنات و سیأت کا نام دیا یعنی صفات الٰہیہ کے مطابق چال

امور کا نام نیکی اور ان کے منافی شان کا نام بدی تجویز کیا۔
پھر ان ہی اسماء حسنیٰ کے مناسب حال اوامر نواہی تجویز کئے ہیں۔
یعنی جن احکام پر چل کر ہم میں اسمائے الہیہ کا رنگ پیدا ہو جائے
وہ اوامر قرآنیہ ہیں اور جن امور سے بچنے پر ہم خدائے تعالےٰ
کی صفات تنزیہیہ کے سایہ تلے آجاتے ہیں۔ وہی نواہی
یا منہیات قرآنیہ ہیں۔ گویا قرآنی حدود و شرائع دراصل اسمائے
الہیہ کے ہی مقتضیات ہیں ان ہی حدود و شرائع کے مناسب
حال عبادات و اعتقادات تجویز کئے گئے ہیں جنہیں بعض جگہ
مناظر کائنات سے مبرہن کیا گیا ہے۔ یا بعض جگہ اُن
لوگوں کا ذکر کر دیا گیا ہے جنہوں نے ان اوامر و نواہی کے
کے مطابق چلکر یا بالفاظ دیگر اپنے حالات کو اسمائے الہیہ
کے منشاء تلے لاکر انعمت علیہم کا خطاب پایا ہے۔ اور جو
ان سے غیر ہیں اُنہیں مغضوب اور ضال کے نام سے
یاد کیا ہے۔ یہ کل کی کل تعلیم قرآنی کا خلاصہ ہے۔ یعنی اللہ۔
اسمائے الہیہ۔ ان اسماء کے مطابق عبادات۔ ان کے مطابق

حدود شرائع موسوم بہ صراط مستقیم انعمت علیہم مغضوب ضال گویا جو کچھ ہے وہ اللہ ہی اللہ ہے۔ اس لئے یہ جو کہا گیا ہے کل قرآن سورۂ فاتحہ میں آجاتا ہے اور یہ کل کی کل سورت ایک لفظ اللہ کے اندر محصور ہو جاتی ہے۔ اس کی حقیقت بھی یہی ہے۔ یہ سب کچھ ایک ذات پاک اللہ کے جلوے اور کرشمے ہیں خود کل کی کل کائنات بھی اسمائے الٰہیہ کے ہی آثار و اطلال ہیں۔ اس لئے لا الہ الا اللہ کا کہنے والا اگر دونو جہان میں فلاح پا جائے تو یہ عین حقیقت ہے من قال لا الہ الا اللہ فقد دخل الجنۃ ایک سچی بات ہے۔ ہاں لا الہ الا اللہ کہنے سے مراد صرف ان کلمات کا دُہرانا نہیں +

یہ اسماء حسنہ قریبًا سب کے سب اُن اخلاق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کا اکتساب انسانی چار دیواری میں ہمارے لئے ممکن ہے۔ بلکہ وہ اسماء جنہیں بعض نے اسمائے ذات کہا ہے ظلی طور سے اُن کا ظہور بھی ہم سے ہو سکتا ہے

یہ امر بدیہی ہے کہ ہم وہی چیز سمجھ سکتے ہیں جس کی کیفیت سے ہم خود بھی آشنا ہوں۔ ذات باری کی کوئی حقیقت ہو لیکن اس کا وہی پہلو ہماری تعلیم و فہم میں آسکتا ہے جس کا احصا اور اندازہ ہم کر سکیں۔ ہم رحیم۔ غفار۔ ستار۔ شکور۔ قہار جبار کی حقیقت سے آشنا ہو ہی نہیں سکتے۔ جبتک رحم۔ غفران عیب پوشی۔ شکرگزاری۔ قہر۔ جبر۔ ہماری فطرت میں مرکوز نہ ہو۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ خود انسان نے خدا کے وہ صفات تجویز کر لئے جو انسان میں موجود تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان صفات کاملہ کا انکشاف اور بہت سے لوگوں پر ہوتا۔ کوئی منجھا ہوا دماغ ان کی تہ کو پہنچتا۔ عرب جیسی زمین جہالت میں سے ایک امی انسان پر یہ راز ہائے الوہیت نہ کھلتے۔ اصل بات یہ ہے کہ خدائے تعالےٰ نے انسان کے مطابق حال اپنے آپ کو اُسے دکھلایا۔ انسان کی استطاعت کے موافق اپنی جلوہ آرائی کی۔ اور یہ وہ بات ہے جسپر ہماری فطرت خود گواہی دیتی ہے۔ کائنات کی ہر ایک چیز راز ہائے سربستہ کا مجموعہ

ہے لیکن ہم اپنی استعداد کے ہی مطابق اُن رازوں کو سمجھتے ہیں۔ ہمارا کسی چیز کا اندازہ اُس چیز کے حقایق کو ختم نہیں کر دیتا۔ وہ اندازہ دراصل ہماری قابلیت و اہلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسمائے الٰہیہ کی بھی یہی حالت ہے۔ ہم خدا کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتے اُس کی صفات کو بھی کما حقہ نہیں سمجھتے اس لئے خالق فطرت انسانی نے اول فطرت میں خاص قسم کے جوہر رکھ دیئے۔ اور اُن جوہروں کے مطابق حال ہم پر اپنی ذات کو ظاہر کیا۔ یا یوں کہو کہ اپنی صفات کی بعض کیفیات کے حصول کی استعداد ہم میں رکھکر اپنی ذات کو بطور نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا۔ اور ہماری تکمیل نفس کے لئے ہمارا مطمح نظر اپنے آپ کو بنایا۔ اسی امر کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انسان خدائے تعالیٰ کی تصویر پر بنایا گیا ہے +

اس حقیقت کو سامنے رکھکر ایک انسان آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ کہ کس طرح ایمان بر توحید باری تکمیل و تہذیب

نفس کے لئے ضروری ہے ہم میں صفات الٰہیہ کے مناسب حال استعداد یں موجود ہیں. ان استعدادوں کو ہی نشوونما دیگر ہمیں سنوده اخلاق سے متصف ہو جانا ہے. صفات الٰہیہ گویا ہمارے اخلاق کا معیار ہیں. لہذا اخلاق فاضلہ ہمارے جذبات کی اس شکل کا نام ہے جس میں صفات الٰہیہ کا رنگ پیدا ہو جائے. ایسے ہی اخلاق ذمیمہ جذبات انسانی کی وہ صورت ہے جو ان اسماء کے نقیض میں ہو. لہذا توحید کا ماننا بھی ہو گا کہ ہم اپنے اخلاق کو خالصتاً صفات الٰہیہ کے سلنچے میں ڈھالیں اُن میں کسی خُلق غیر کی ملونی نہ ہو. یہ امر بہت مشکل ہے لیکن اگر ہو جائے تو اس تکمیل نفس پر انسان میں ملکوتی صفات پیدا ہو جاتے ہیں ؛

ایمان بالتوحید سے سلطنت کا قیام

صفات الٰہیہ مندرجہ قرآن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسانی سوسائٹی کے مختلف افراد. اپنی اپنی جگہ اور اپنے متعلقہ فرائض کی ادائیگی میں اپنے اندر اُن صفات کا رنگ

پیدا کریں تو انسانی سوسائٹی حدکمال کو پہنچ جائیگی۔ زمین پر آسمان کی بادشاہت آجائیگی۔ اور جو مرضی خداوند آسمان پر ہے وہی زمین پر ہوگی۔ مسیح کی دعا کا یہی مقصد تھا اور وہ پوری بھی اسی طرح ہوسکتی ہے۔ یہ کوئی فرضی اور خوش کن باتیں نہیں بلکہ آنحضرت کے زمانہ نے اور اُن کے بعد کے چند سالوں نے اس آسمانی بادشاہت کو عرب کی سرزمین میں دیکھا۔ مثال کے طور پر ہم اس ایمان بالتوحید کے مسئلہ کو جس طرح ہم بیان کر رہے ہیں امور سلطنت پر حاوی کرتے ہیں۔ اگر بادشاہان وقت اس رنگ میں توحید پر ایمان لے آویں تو آج سب پولٹیکل پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں۔ مسلمان بادشاہ وقت کو خدا کا ظل سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی بادشاہ وقت یا سلطنت صفات الٰہیہ کا رنگ اپنے طرز عمل میں پیدا کرے تو اُس سلطنت کی مداومت یقینی ہو جاتی ہے۔ یہ سب کی سب صفات الٰہیہ سورہ فاتحہ کے صفات مندرجہ میں جمع ہو جاتی ہیں۔ رب العالمین۔ رحمٰن۔ رحیم۔ مالک یوم الدین اسی لئے ان چار صفات کو ام الصفات کہا گیا ہے رب العالمین

کی حکومت ہیں جیسے کہ ان الفاظ کے معانی سے ظاہر ہوتا ہے کوئی قومی۔ ملکی۔ لسانی۔ لونی۔ تمیز نظر نہیں آتی۔ اس کا فیض ربوبیت ہر ایک تک یکساں پہنچتا ہے۔ وہ اپنے پرستاروں میں اگر ایک ہی محبت سے پرستش کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اُس کی برکات سب کے لئے یکساں کھلی ہیں۔ خدا تعالےٰ کی ذات انسان کی ذات سے الگ ہے۔ لیکن اُس کی غیر جانبداری نے اُس کی حکومت کو ہر ایک کی نگاہ میں یکساں عزیز کر رکھا ہے ہم پر اس کی حکومت ہمارے ہی فائدہ کے لئے ہے۔ اب ایک انسانی حکومت کے لئے ان اخلاق الٰہیہ کا اپنے میں پیدا کر لینا کونسا مشکل ہے۔ کہنے کو تو ہر ایک سلطنت اپنی محکوم رعایا پر یہی ظاہر کرتی ہے۔ کہ ہماری سلطنت رعایا کے فائدہ کے لئے ہے۔ لیکن یہ ڈپلومیسی ہے۔ جس کی کوئی حقیقت اب باقی نہیں رہی۔ آج ہوم رول کے جھگڑے ختم ہو جاتے بلکہ ہوم رول کا نام بھی کسی زبان پر نہ ہوتا اگر حاکم قومیں رب العالمین کا رنگ اختیار کر کے اپنی اور محکوم قوم میں تمیز کو

آزاد دیتیں۔ اس کے بعد سلطنت میں رحمانیت کا رنگ یہ ہوگا کہ رعایا کی استعدادوں کو نشو ونما دینے کے لئے اور مقبوضہ ممالک کے طبعی اور مخفی خزائن کو بار ور کرنے کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے بلا طلب واستدعائے رعایا مختلف مدارس اسکول۔ انسٹی ٹیوشن۔ بنائی جائیں اس کا الگ بوجھ رعایا پر نہ ڈالا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی گورنمنٹ نے کسی ملک کے فائدہ میں اسی ملک میں سے حاصل کردہ روپیہ خرچ کرنا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک طرح سے گورنمنٹ رحمانیت کا رنگ اپنے اندر پیدا کرسکتی ہے۔ رحمانیت سے مراد بلا عوضہ مہربانی کرنا ہوتا ہے۔ اگر گورنمنٹ محاصل تو ایک رنگ میں وصول کرے اور اُسے ایسی انسٹی ٹیوشن میں مفت خرچ کردے تو شان رحمانیت اُس میں پیدا ہوجائیگی لیکن مشکل تو یہ ہے کہ آجکل کی گورنمنٹیں خواہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتی ہوں مفاد ذاتی کے لئے حکومت کرتی ہیں۔ خلیفہ ثانیؓ کی فوجوں کی طرح آجکل کی سلطنتوں کی فوجیں دوسرے ممالک کو اس لئے فتح نہیں کرتیں

کہ وہاں کی رعایا کو غاصبانہ حکومت سے نکال کر رعایا کے فائدہ کے لئے ملکداری کی جائے۔ آج کسی زمین پر قبضہ و حکومت تاجرانہ اصول پر کی جاتی ہے۔ یہ دیکھ لیا جاتا ہے کہ اُس ملک کے محاصل اخراجات حکومت سے بہت زیادہ ہوں۔ اور بچت کا بہت سا حصہ حاکم قوم کے حصہ میں آوے۔ والّا اُس ملک کی طرف رُخ بھی نہیں کیا جاتا جہاں جہانبانی محض رعایا کے فائدہ کے لئے ہو۔

شانِ رحیمیت خداتعالےٰ کی یہ ہے کہ انسان کے ایک عمل کے عوض خدا کا اجر دس یا سو گنا ہوتا ہے۔ اسپر کوئی حکومت عمل کر کے دیکھ لے پھر اجنبی ہونے پر بھی رعایا میں عزیز ہو جائیگی آجکل کی گورنمنٹیں بلا معاوضہ مہربانی تو کرنا جانتی ہی نہیں لیکن جو مہربانی اُن کی کسی عوض میں ہوتی ہے۔ وہ بھی کوئی اچھا معاوضہ نہیں ہوتا مختلف محکمہ جات میں جو تنخواہیں ملتی ہیں انہیں خدمات مفوضہ سے کوئی بھی نسبت نہیں۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ مغربی مذاق اس معاملہ میں مشرق سے بالکل جداگانہ ہے ایشیائی مزاج

بادشاہ میں خدا کو دیکھتا ہے۔ اس لئے افضال بادشاہت بارش کی طرح مستحقین اور غیر مستحقین پہ آٹھوں پہر ہونے چاہئیں اور یہ کچھ فرضی داستان نہیں۔ مشرقی بادشاہ یوں ہی کیا کرتے تھے بالمقابل مغربی لوگ ہر رنگ میں تجارتی اصولوں کے دلدادہ ہیں۔ کچھ بھی ہو اگر بادشاہ خدا کے ظل ہیں۔ بادشاہ چھوڑ اگر کوئی فرد اُسی وقت کامل انسان کہلا سکتا ہے۔ جب یہ رنگ اسمیں ہوں تو پھر مغربی اصول سلطنت۔ حکومت کو ہر دلعزیز نہیں بنا سکتے۔ آخر میں مالک یوم الدین کا رنگ خدائی معاملات میں یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو اُس کے عمل کے مطابق جزا سزا ملے۔ اسمیں بھی جزا کا پہلو تو ہمیشہ جاری رہتا ہے لیکن سزا دہی میں یہ طریق برتا جاتا ہے کہ جہاں کسی انسان کا گناہ کسی دوسرے انسان کے حقوق پر برا اثر کرتا ہے اُس گناہ کی سزا لازمی ہوتی ہے۔ لیکن جو گناہ ذات باری کے خلاف کسی سے سرزد ہوتا ہے۔ اس میں ربانی حکومت عفو کا پہلو زیادہ لئے ہوئے ہے۔ دنیوی حکومت میں یہ رنگ مالکیت اُس وقت پیدا ہوگا جب ایسے جرائم

ہیں گورنمنٹ کشادہ دلی اور رحم سے زیادہ کام لے جو خاص گورنمنٹ سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہاں اس رحم کے بھی مناسب حدود ہیں۔ یعنی جب ایسے جرائم حکومت کی بنیاد کو ہلانے لگ جائیں تو پھر عفو کا دروازہ بند ہونا چاہیئے ؛

جہانتک میں غور کرتا ہوں آجکل کی گورنمنٹوں میں پہلی تینوں باتیں بہت سی حد تک مفقود ہیں۔ اگر کوئی رنگ ہے تو خدائے تعالے کی اس چوتھی صفت کا رنگ ضرور ہے۔ لیکن مالکیت کی ایک اور بھی شان ہے جس کا لحاظ اگر یہ حکومتیں کریں تو یہ امر ان کے قیام اور ہر دلعزیز ہونے کے لئے از حد مفید ہوگا۔ اگر حاکم کا تعلق محکوم سے ملکیت کا ہے تو پھر اس کی سزا دہی میں تادیب کا رنگ ہونا چاہیئے۔ مالک نہیں چاہتا کہ اس کا مملوک سزا کے بوجھ سے ہلاک ہو جائے کیونکہ اس سے اسکی ملکیت میں کمی واقع ہوگی مطلب یہ ہے کہ مالک یوم الدین کی سزا دہی ایک دشمن کی دشمن کو سزا دہی کی طرز پر نہیں ہوتی جسمیں انتقام کا رنگ ہوتا ہے بلکہ مالک کی سزا دہی مالک کے اپنے فائدہ کے لئے ہوتی ہے

تاکہ مملوک اصلاح پاکر مالک کو نفع پہنچائے۔ اگر آجکل کے حکام بھی گورنمنٹ کے خلاف جرائم کی پاداش میں منتقمانہ رنگ اختیار نہ کریں۔ نہ اس قسم کی سزائیں تجویز کریں جو مجرم کو ہلاک ہی کردیں بلکہ سزا بغرض اصلاح ہو تاکہ مجرم سزا کے بعد ایک مفید رعایا بن جائے۔ تو اس سے ایک غیر قوم کی حکومت بھی اپنی قوم کی حکومت بن جاتی ہے +

یہ چند باتیں ہمارے مضمون سے تو صرف اسی قدر تعلق رکھتی ہیں کہ اگر کل انسانی سوسائٹی کے افراد توحید پر قدم رکھیں اور وہ ان معاملات میں یہ ہے کہ ہر انسان اپنے مناسب حال اخلاق الٰہیہ مندرجہ قرآن کا مظہر بننے کی کوشش کرے تو آج دنیا تمام مصائب سے آزاد ہو جاتی ہے۔ حکومت و سلطنت چونکہ انسانی سوسائٹی کے چلانے کا ایک ضروری نظام ہے اس لئے ان لوگوں کو بھی جو حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان معنوں میں توحید پر قدم مارنا چاہیئے حکام وقت کو ایسے موحد بننے کی اگر کبھی ضرورت تھی تو آج ہے کیونکہ حاکم محکوم

قوموں میں عموماً مغائرت قومی ہے۔ حکام وقت کا ہر فعل نہایت نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آج اس ملک ہند میں بھی سخت بے چینی ہے۔ جس ملک میں خود مختلف قومیں مختلف زبانیں موجود ہوں۔ وہاں حکومت کی غیریت قوم نہایت ہی آسانی کے ساتھ مٹ سکتی ہے۔ اگر حکام وقت میں رب العالمینی۔ رحمانیت۔ اور رحیمیت کا ایک ادنیٰ رنگ بھی پیدا ہو جائے +

حکام کے بالمقابل رعایا کے طرز عمل کے لئے بھی ایک عمدہ دستور العمل ان ہی اسمائے الٰہیہ پر غور کرنے سے پیدا ہو جاتا ہے جن کے ماتحت مختلف قسم کے اوامر و نواہی قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی۔ قرآن ہی کو کل کتب مقدسہ پر ترجیح ہے۔ جہاں اور کتب مقدسہ قریب قریب خاموش ہیں وہاں اگر کوئی حکومت اپنی مسلمان رعایا میں جذبۂ اطاعت و انقیاد پیدا کرنا چاہے تو الفاظ قرآنی سے استمداد کرے خلاف ورزی قانون۔ فساد۔ بغاوت۔ غداری۔ حدود سے تجاوز

کرنا۔ تلافِ حقوق۔ ان تمام امور سے خدائے قرآن اپنی نفرت ظاہر کرتا ہے۔ قرآن نے قومی حکومت کو تو ضرور پسند کیا ہے لیکن غیر قوم حاکم کی اطاعت بھی واجبات میں رکھدی ہے۔ واطیعوا اللہ و اطیعو الرّسول و اولی الامر منکم رتم اللہ اور اس کے رسول کی اور اپنے میں کے حکام کی اطاعت کرو) جیسی صریح تعلیم کہیں اور ملنی مشکل ہے۔ اگرچہ اولی الامر منکم کے معنے کرنے میں اس وقت دو رائیں پیدا ہوگئی ہیں۔ بعض منکم کے خطاب کو مسلمانوں تک محدود کرتے ہیں۔ بعض اس سے مراد بنی نوع لیتے ہیں۔ ایک جماعت کا تو یہ خیال ہے کہ ہم ان حکام کی اطاعت کرو جو تم میں سے یعنی مسلمانوں میں سے ہوں۔ دوسروں کے نزدیک منکم کے خطاب سے مراد انسانوں میں سے کوئی حاکم ہے۔ مجھے خود آخر الذکر سے اتفاق ہے۔ علاوہ ازیں کسی قضیہ منطقی کا عکس لازمًا صحیح نہیں ہوتا۔ منکم سے اگر مراد مسلمان ہی ہوں تو اس سے غیر مسلم حاکم کی اطاعت سے انکار نہیں ہوسکتا۔ وہ مذہب جو عالمگیر ہونے کا دعوے کرے۔ اور جس کی کتاب

آخری کتاب ہونے کی مدعی ہو وہ ایسی تعلیم نہیں کر سکتی جس کے رو سے غیر قوم کی اطاعت کے ماتحت مسلمان اسلامی فرایض سے ماہر ہو جاویں۔

آخر قرآن نے بغاوت اور خلاف ورزی قوانین وقت سے مسلمانوں کو روکا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نواہی صرف مسلم سلطنتوں سے تعلق رکھیں اور غیر مسلم حکومت کے ماتحت یہ قرآنی احکام بے اثر سمجھے جاویں۔ قرآن نے تو کہیں ایسی تخصیص نہیں کی۔ قرآن اس بات پر شاہد ہے کہ قیامت تک مسلم اور غیر مسلم رہینگے۔ یہود و نصاریٰ کا قیام بھی قرآن اخیر تک بتلاتا ہے۔ ساتھ ہی کسی خاص قوم کی حکومت کی قطعیت بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ خدا کے ہاں جہانبانی کی اہلیت کے چند امور مقرر ہیں جن میں وہ امور پائے جائیں انہیں سلطنت مل جاتی ہے۔ اس کی شاہد سورۂ ملک ہے لیبلوکم ایکم احسن عملا بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بلا تمیز مذہب و ملت جس قوم میں خدا تعالے اہلیت حکومت دیکھتا ہے اُسے عطا کر دیتا ہے۔ در

اصل اس حد تک وہ قوم مالک الملک کی مومن ہوتی ہے
ہاں جب وہ قوم تعیشات و تعصبات میں پڑ کر وہ اصول
ہاتھ سے دے بیٹھتی ہے تو پھر تنزع الملک ممن تشاء کی
منشاء کے پورا ہونے کے دن آجاتے ہیں۔ جو کتاب یہ
اصول تعلیم کرے پھر جس مذہب کی تعلیم کرے اُس مذہب کے
لفظی معنی امن ہوں کیونکہ اسلام کے معنے امن کے ہیں جس نے
امن کی یہاں تک عزت کی ہو۔ کہ اس مذہب کے پیرو کسی اور کو
ملنے پر سلام علیکم کہا کریں۔ یعنی تم پر امن ہو۔ اس مذہب کے
متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ غیر قوم کی اطاعت کے خلاف تعلیم کریگا
یہ حقیقت اسلام سے نہ صرف ناآشنائی ہی ظاہر کرنا ہے بلکہ اس
قسم کا خیال بھی اسلام پر خود لائبل ہے۔ ہاں واولی الامر منکم
والی آیت ہر مسلم اور غیر مسلم پر ایک طرح حاوی بھی ہو سکتی ہے
اگر غیر قوم کے حکام غیریتِ قوم کو اڑا دیں پھر وہ کسی مذہب و
ملت کے ہوں اغراض جہانبانی کے لئے وہ محکوم قوم میں سے
ہو جائینگے۔ جو حکومت ایسی راہیں اختیار کرتی ہے کہ جن سے

اس کی قوم اور محکوم قوم میں فرق نظر آئے جس کا محکوم قوم سے
جو سلوک ہے وہ اپنی قوم سے نہیں۔ وہ اپنے طرز عمل سے
لباس غیر جنسیت پہنکر رعایا کو یہ دکھلا رہی ہے کہ منکم سے
نہیں۔ میں نے تو اس آیت پر بہت ہی غور کیا مجھے تو یہ ہی
سمجھ آتی ہے کہ منکم ایک وسیع لفظ ہے جس میں مذہب و ملت
کی تمیز نہیں۔ ہاں از روئے تعلیم اسلام جہانبانی کا بھی ایک
مذہب ہے۔ جس کی شریعت عدل و نصفت شعاری ہے۔
اس کا جو حاکم پابند نہیں وہ فی الواقع منکم میں سے نہیں۔
الغرض انسان کی بہترین آداب و اخلاق کا معیار اسمائے
حسنیٰ ہیں۔ آج مسلمانوں میں سخت اصلاح کی ضرورت ہے۔
جہانبانی چھوڑ وہ معمولی اخلاق و آداب سوسائٹی سے بھی
الگ ہوتے جاتے ہیں۔ روٹی کما لینا اور اپنے بچوں کی
پرورش کرنا کون نہیں جانتا ؟ مگر ہماری قوم تو اسکے صحیح راہوں
سے بھی ناواقف معلوم ہوتی ہے۔ ہم سے وہ باتیں دن
بدن مفقود ہوتی جاتی ہیں جن سے ہم من حیث القوم دنیا میں

زندہ رہ سکتے ہیں۔ جبل طارق اور مالٹا کے کوچوں میں میں نے مُوروں کے بچّوں کو چلتے پھرتے بھلی بُری روٹی کماتے دیکھا ہے لیکن آج مُور من حیث القوم دنیا سے مٹ چکے یہی حالت اور جگہ بھی پیدا ہو جائیگی۔ اگر مسلمان نہ سنبھلیں۔ خود اس ملک ہندوستان میں جو پولٹیکل گداگری ہمارے حصہ میں آئی ہے اور جو کالائے دیگراں سے زینت محفل ہو رہی ہے وہ ہمیں فقیر وگداہی بناکر چھوڑیگی۔ جہاں اسلام و توحید اسلام ہمیں وطن داری اور مفاد واغراض وطن میں غیر مسلم کے ساتھ شرکت اور ملکر کام کرنے کا حکم دیتی ہے وہاں شان اسلام و توحید نازم بر قوت برادر کو اک شرک قرار دیتی ہے۔ ایک موحد مسلمان کی غیرت کا تقاضہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ جو کچھ کرے اپنے بل پر کرے اُس کے اپنے دست و بازو اُس کا سہارا ہیں۔ کیا خود مسلمانوں کی تعداد اس ملک میں تھوڑی ہے ؟ ہاں ان میں اسلامی سیر اور موحدانہ کیر کٹر نہیں۔ ورلا تنظیم وحدت جو شعار اسلامی ہے وہ مٹھی بھر مسلمانوں سے بہت کچھ کرا سکتا ہے۔ آج کسی سیاسی امر

پر کیا کل کے کل باشندگان ملک ایک رائے رکھتے ہیں؟ کیا کل ہندو بھائی کسی ایک امر میں متفق ہیں۔ ان دونوں باتوں کو چھوڑیئے کسی ایسے امر پر جہاں کچھ ہندو اور کچھ مسلمان اکٹھے ہو کر کام کر رہے ہیں۔ اگر ان متفقہ عنصروں کی تعداد گن لی جائے تو یاد رکھو اس تعداد سے کئی ہزار گنا زیادہ مسلمان اس ملک میں موجود ہیں۔ اگر تمہارے مطالبات اور تمہاری راہیں اسلام اور قرآن کے مطابق ہیں تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ تمہارے ساتھ ہو جائیں۔ تم کیوں نظام اسلام کو درست نہیں کرتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس ملک کے کسی غیر مسلم باشندے سے امر حقہ میں اتفاق نہ کرو۔ ایسا کرنے کے لئے تو قرآن خود حکم دیتا ہے جو میں چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان معاملات میں تم خود مسلمانوں پر حصر کرنے کے قابل ہو جاؤ اگر کسی وقت دوسرے تمہارے ساتھ نہ بھی ہوں تو تمہیں کوئی احتیاج نہ ہو تم دوسروں پر ظاہر کر دو کہ اگر ہم تم سے ملکر کام کرتے ہیں تو نہ صرف اس لئے کہ ہم دونوں کو ایک تیسری قوم سے

مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ یہ امر سب سے اول قرآن کے خلاف ہے۔ لایجرمنکم شنان قوم کا حکم اس کے مخالف ہے کسی کے خلاف اس لئے ہوجانا کہ وہ ہماری قوم سے نہیں یا اُن سے ہمیں قومی تخالف یا عداوت ہے۔ خلاف شان اسلام ہے۔ علاوہ ازیں اگر ایک قوم کی مخالفت نے آج دو الگ قوموں کو جمع کرا دیا ہے تو پھر کل ان دو میں رقابت یقینی شروع ہوگی۔ ہماری محبت اور ہمارا بغض صرف اللہ کے لئے ہونا چاہئے۔ اگر حکام وقت سے ہم کوئی امر حاصل کرنا چاہتے ہیں اور وہ امر تعلیم قرآن کے خلاف نہیں تو تم برادرانِ وطن کے ساتھ بیشک صرف اس اصول پر ملو کہ وہ ان مطالبات میں تم سے متفق ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اُن کو یقین دلا دو۔ اور اس یقین دلانے کے قابل بھی بن جاؤ کہ تم امر حقہ بلاشراکت غیرے بھی حاصل کر سکتے ہو۔ اور یہ اس لئے کہ تم توحید پرست ہو اور ایک ایسے خدا کو پوجتے ہو جو لاشریک لہ ہے۔ جو غنی ہے اور جس کا نام صمد ہے۔ یعنی جو بے نیاز ہے جو کسی کا

محتاج نہیں بلکہ اوروں کی احتیاجیں اس کی طرف ہیں یہ شان توحید تم میں ہونی چاہئے۔ لوگوں کی احتیاجیں تمہاری طرف ہونی چاہئیں نہ یہ کہ تم دریوزہ گری اختیار کرو۔ اور اپنی احتیاجیں اُن تک لیجاؤ۔ تمہیں جو رسالت مآبؐ کی سرکار سے حکم ملا کہ تم اپنے نام اللہ تعالےٰ کے کسی اسم کے ماتحت بہ رشتہ عبدیت رکھا کرو۔ اس کا مطلب صرف یہی تھا کہ تم میں اپنے اندر اس نام کی کیفیات پیدا کرنے کی توجہ ہو جائے۔ عبدالصمد یا صمد کا پرستار وہی ہے جو حسب تصریح بالا شان صمدیت کا انسانی رنگ اپنے اندر رکھتا ہے۔ تمہاری نمازوں میں تمہیں اگر سورۂ اخلاص کے پڑھنے کی سفارش کی گئی تھی اس کا بھی تو یہی مطلب تھا۔ تم نے اس حکم کو اس لئے تو قبول کر لیا کہ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت تمہیں قرأت کے لئے مل گئی لیکن اس سورت کا مقصد تمہاری نگاہ سے مٹ گیا۔

میں واضح طور پر بیان کر چکا ہوں کہ خدائے تعالےٰ کو نہ تمہاری حمد و ثنا کی پرواہ نہ اُسے تمہاری تسبیح و تحلیل کی

ضرورت ہے یہ جو کچھ ہے تمہارے اپنے نفس کے لئے ہے
فانما یشکر لنفسہ تمہیں یہ ہی ہدایت کرتا ہے تم اپنے
مقام کو دیکھو۔ کہ تمہاری پیروی کے لئے تمہارے سامنے
کس قدر عظیم الشان ہستی کھڑی کی گئی ہے۔ تمہاری راہوں
میں اور تمہارے منظروں میں کسی بڑے انسان۔ حکیم سپہ سالار
بادشاہ یا کسی فن میں کسی بڑے ماہر کا بت اسلام نے نصب نہیں
کرایا۔ جیساکہ اس وقت مہذب قوموں کے شہروں میں ایسے
بت نصب شدہ نظر آتے ہیں۔ اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ
چلنے پھرنے والے ان لوگوں کے حالات و تاریخ کو اپنے سامنے
رکھکر ویسا بننے کی کوشش کریں۔ یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے
خدائے واحد نے تمہارے سامنے تم میں اپنا رنگ پیدا کرنے
کے لئے اپنے آپ کو چار رنگوں میں آٹھوں پہر پیش کیا ہے۔
ان بتوں سے جو مقصد ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے
تم سے پانچ وقت رب۔ رحمن۔ رحیم مالک یوم الدین کی عبادت
کرائی گئی۔ تمہاری شاہراہ میں یہ چار سائن بورڈ کھڑے

کئے گئے۔تمہاری سوسایٹی خواہ تنگی و فاقہ مستی کے کسی مقام پر ہو۔تم میں کے اہل دول آج ان چار صفات کے رنگ میں رنگین ہو جائیں تو تم یقین کر لو کہ مسلمانوں میں سے فقر و فاقہ آج کافور ہو جائے۔اسی طرح اگر ہر ایک مسلمان سورۂ اخلاص کو پڑھتا ہوا۔اس کے مندرجہ اسمائے حسنیٰ کی کیفیات سے اپنے آپکو مکیف کرنے کے فکر میں لگ جائے تو پھر مسلمان افراد اپنی اپنی شخصیت میں فرد عالم بن جائیں +

بعض متکلمین نے اسمائے مندرجہ سورۂ ہذا کو اسمائے ذات کی فہرست میں درج کیا ہے۔اور اسے تخلقوا باخلاق اللہ کے دائرہ سے باہر رکھا ہے ممکن ہے کہ انکا خیال صحیح ہو۔لیکن میں تو یہی کہونگا کہ اسم ذات تو ایک اللہ ہی ہے جس کی حقیقت سے ہم آشنا ہیں۔باقی جن نام سے قرآن نے اُسے موسوم کیا ہے ان کا انسانی ادراک میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان اُن کی کیفیات سے قطعًا ناآشنا نہیں۔بلکہ ہمارے جذبات میں اُن تمام اسماء کی استعداد

ہے اور وہی ہماری ترقی کا موجب ہے۔ کسی فن میں اشتراک کا بننے کی خواہش ہی انسان میں اپنے ہمعصروں سے گوئے سبقت لے جانے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ہاں خدا کی وہ شان اپنا رنگ خاص رکھتی ہے جو شرکت سے ہر طرح ارفع و اعلےٰ ہے۔ ہم جب اسم حسنہ کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اس میں ہمارا ہم رنگ ہونا بھی حدود انسانی کے اندر ہوتا ہے اس لئے سورۃ اخلاص میں جن صفات باری کا ذکر کیا گیا ہے ان کا رنگ بھی ہم میں انسانی حدود تک ہی آئیگا۔ لیکن یہ وہ رنگ ہے کہ اس کے چڑھنے پر ایک کنگال غنی ہو جاتا ہے ایک گمنام دنیا کی آنکھ کا تارا بن جاتا ہے۔ شان احدیت اس امر کی متقضی ہے کہ اس شان کا متصف ہر رنگ میں بےنظیر و بےعدیل ہو۔ کیا سورۃ اخلاص کے ورد کرنے والے کا فرض نہیں کہ وہ کسی ایک فن۔ انسانی کاروبار کی کسی ایک شاخ کسی ایک علم۔ صنعت۔ یا ہنر میں شان احدیت اپنے اندر پیدا کرے۔ کیا دنیا میں ایسے انسان پیدا نہیں ہوئے۔ یا

آج موجود نہیں۔ ہاں نہیں موجود تو مسلمانوں میں نہیں میرے ایک زنگوبی دوست سیٹھ عبد الکریم حاجی غنی اگلے دن شریک کانگریس ہوکر بادل درد مند واپس آئے ان کے عمر میں یہ پہلی کانگریس تھی جس میں انہیں پلیٹ فارم پر کسی امر متحدہ میں ہندو مسلمان اکٹھے بولتے نظر آتے تھے لیکن جس بات نے انہیں دل ہی دل میں رُلا دیا وہ یہ تھی کہ جہاں برادران وطن پلیٹ فارم پر انگریزی بولنے میں بلبل ہزار داستان بنے ہوئے تھے ان کے مقابل مسلمان آٹے میں نمک بھی نہ تھے۔ کیا یہی قوم خدائے احد کی پرستار ہے؟ کیا ان میں سے ہی بعض کا نام عبد الاحد اور عبد الواحد ہوا کرتا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس قوم نے اکتساب علوم و فنون میں شان احدیت گنوا دی ہے۔ وہ قوم رسول چھوڑ اس اسکیم جدید میں بھی کیا بنا لینگے +

صمد تو اس خدا کا نام ہے جس کی طرف بفحوائے الذی یصمد الیہ فی الحوائج لوگوں کو احتیاجیں لیکر آنا ہے۔ وہ دوسروں کا منحصر علیہ ہے اور کسی اور کی طرف احتیاج کے لئے دیکھنے

سے بے نیاز۔ کیا ایسے موحد انسان جن میں شان عبد الصمد ہونی چاہئے۔ ہماری سوسائٹی میں آج موجود ہیں؟ ادنےٰ سے ادنےٰ احتیاجوں کے لئے ہم دوسروں کے دروازہ پر منڈلاتے پھرتے ہیں۔ یاد رکھو تم صرف انسانی لباس میں شان صمدیت پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ تمہارے ہزارہا مقاصد بلا احتیاج غیر کے پورے ہو جائینگے۔ اس سورت شریف کے باقی صفات تو بظاہر مختلف قسم کی شرک پرستیوں کا ازالہ کرتے ہیں۔ لیکن ہم مسلمان نہ کسی کو خدا کا فرزند قرار دیتے ہیں نہ کسی کو اس کا کنبہ جانتے ہیں۔ صرف انسان ہی باپ بیٹے کے رشتے اور کفو کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ لیکن ایک موحد انسان کے سامنے ایک خاص رنگ توحید اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد میں بھی ایک سبق ہے۔ انسان کی اولاد اور اس کا کنبہ اس کا کسی خاص جگہ۔ کسی خاص مقام اور کسی خاص وطن سے تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ یہی باتیں اس کے لئے فتنہ و اغلال ہو جاتی ہیں۔ جیسے کہ قرآن نے فرمایا

ہے۔ ان اولادکم واموالکم فتنہ بڑے بڑے مقاصد عالیہ جن سے قومی اور ملی اغراض و مفاد وابستہ ہوتے ہیں محض اولاد وطن کی محبت سے رہ جاتے ہیں۔ شان توحید کا تقاضا یہ ہے کہ ایک انسان صاحب عیال ہو کر حکم خداوندی کی تعمیل میں عیال و اولاد کو حارج ہونے کی اجازت نہ دے اگر مقاصد مذہب اُسے وطن چھوڑنے پر مجبور کرے تو بلا جبر و اکراہ ہجرت وطن کر دے۔ محبت مقام و وطن جیسا کہ میں نے بیان کیا کفو داری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ بھی دراصل ایک قسم کے بُت ہی ہوتے ہیں۔ ہاں وہی انسان ان بُتوں کو توڑ سکتا ہے جو لباس انسانی میں شان لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد کا مظہر بن جائے۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ انسان حقوق اہل و عیال کی پرواہ نہ کرے۔ یا کفو اور وطن کی ذمہ داریوں سے فارغ بن بیٹھے۔ ایک موحد انسان تو ان فرائض کو اوروں سے بڑھکر ادا کرتا ہے۔ کیونکہ جس معبود کے مختلف رنگوں کو وہ اختیار کر رہا ہے وہ اگر ایک طرف لم یلد ہے

تو دوسری طرف اب اور مجازاً مخلوق کا باپ بھی ہے۔یعنی جہانتک ہماری پرورش کا تعلق ہے۔ہم اطفال الٰہیہ ہیں اور استعارۃً کنبہ الٰہیہ میں داخل ہیں۔لہذا جس طرح لم یلد خدا کے مجازاً اطفال بھی ہیں اور اس کا ایک کنبہ بھی ہے۔اسی طرح ہم فی الواقع صاحب عیال وکنبہ تو ہیں لیکن ایک معنی میں نہ ہمارا کوئی کنبہ ہے نہ کوئی اولاد۔مسلمانو! جہاں تمہیں میں عبد الرب عبد الرحمٰن اور عبد الرحیم بننے کی درخواست کرتا ہوں وہاں سورۂ اخلاص کا بھی ورد کرنے کیلئے زور دیتا ہوں جس سے میری مراد یہ ہے کہ تم اکتساب کمال وفنون میں احدیت کا رنگ اپنے اندر پیدا کرو جس فن میں پڑو ایک بنکر دکھلاؤ۔ تم معاملات احتیاج میں شان صمدیت پیدا کرو تم اپنے اہل وعیال کی۔ اپنے کنبہ کی۔ اپنے دوستوں کی۔ اور ہر انسان کی پرورش میں رنگ ربوبیت پیدا کرو مگر تمہاری اولاد اور تمہاری کفو اور وطن داریاں تمہارے لئے اغلال نہ بن جائیں یعنی ان حالات میں تم لم یلد ولم یولد کی شان دکھلاؤ۔

یعنی نہ تمہاری کوئی اولاد ہے نہ کنبہ۔ نہ وطن خصوصاً جب عزت خدا و رسول یا مذہب کی خدمت تم سے ایسی یکسوئی چاہے۔ آخر مناسک حج میں تمہیں یہی سبق دیا گیا ہے +

اِس کتاب میں اس مضمون پر بہت زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں دیکھتا۔ صرف اِسی قدر وصیت کرتا ہوں کہ تم شان توحید اپنے اندر پیدا کرو۔ اور وہ یہ ہے کہ تمہارے کل جذبات ردّیہ تم پر حکومت کرنا چھوڑ دیں۔ تمہاری ہوا و ہوس تمہاری غلام بن کر تم میں اخلاق کی وہ صورت پیدا کر دے جس میں اسمائے الٰہیہ کا رنگ ہو۔ تمہارے اُبھرنے کا یہی ایک گُر ہے۔ سیرت اور کیرکٹر کے پیدا ہونے پر دولت نصرت فتحمندی۔ اقبال کسی قوم کے پیچھے سایہ کیطرح آجاتی ہے۔ کیا عربوں کے پاس کوئی دولت کوئی طاقت کوئی تلوار کوئی خزانہ تھا۔ دنیا کے کنگال دنیا کے گمنام دنیا کے مالک بن گئے۔ کیا تمہاری موجودہ حالت خواہ کتنی ہی گئی گذری کیوں نہ ہو بعثت اسلام سے پہلے کے

عربوں جیسی بھی نہیں؟ پھر وہ کونسی چیز ہے جس نے اُن کو یگانۂ روزگار بنا دیا۔ اس سوال کے جواب میں مَیں خوب جانتا ہوں۔ کل دنیا کے مسلمان مجھے ایک ہی بات کہینگے یعنی توحید۔ پھر مسئلہ توحید میں بھی تمہاری حالت اُن سے بہتر ہے۔ وہ کمینہ ترین شرک پرستیوں میں مبتلا تھے تم اُن معنوں میں نہ مشرک ہو نہ بت پرست۔ ہاں جس مقام توحید پر وہ بتوں کو توڑ کر کھڑے ہو گئے تھے اُس مقام سے تم خود کوسوں دور ہو۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک انسان نفس امارہ کی پیروی نہ کرے ہوا و ہوس کا غلام نہ ہو۔ اور اپنے ہر جذبہ کو ربانی اخلاق میں منتقل کر دے۔ نہ تمہیں تلوار چاہیئے نہ مال و دولت۔ نہ تمہیں خفیہ سازشوں کی ضرورت۔ نہ سدیشن و غداریوں کی حاجت۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں مسلمان پر حرام ہیں۔ تمہیں اگر ضرورت ہے تو اُس کیرکٹر و سیرت کی جس کے خط و خال اسمائے حسنیٰ ہوں۔ تم ایک منٹ کے لئے تصور تو کرو۔ کہ اگر تم میں سے بعض کا رنگ فتاح۔ قابض۔ باسط

معز ۔ رافع ۔ قیوم ۔ قادر ۔ مقتدر کا ہو بہو شان و شکوہ ہیں تم مجید ۔ متین ۔ ذوالجلال والاکرام وغیرہ ظل بنجاؤ۔ پاکیزگی اور طہارت میں قدوسیت کے ذیل میں آجاؤ۔ شخصی اور منزلی معاملات میں رؤف ۔ وھاب ۔ رزاق ۔ رحمٰن شکور ۔ حلیم ۔ ستار ۔ غفار ۔ کریم وغیرہ کے کامل بندے بن جاؤ۔ امور مہمہ کے حل کرنے میں اور رازہائے فطرت کے سمجھنے میں علیم ۔ حکیم ۔ صبور ۔ خبیر کی تجلیات دکھلاؤ۔ صنعت و حرفت میں خالق ۔ باری ۔ مصور ۔ بدیع ۔ کی عبادت میں لگ جاؤ ۔ پھر حسب ضرورت عزیز ۔ جبار ۔ متکبر کی عبودیت کا دعویٰ کرو ۔ دنیا میں ایسے کام کرو کہ تمہارے مرنے کے بعد تمہاری باقیات صالحات تمہیں عبد الوارث عبد الحی ۔ عبد القیوم ۔ عبد الباقی بناویں ۔ دوسروں کو غلطیوں سے نکالنے کے لئے اور امر حقہ پر انہیں قائم کرنے کے لئے تم ہادی ۔ رشید ۔ شہید کا عکس ہو جاؤ۔ الغرض اگر تم اس انداز پر اسماء الٰہیہ کی عبادت کرو اور اس شکل میں اللہ کو اپنا

مقصود و مطلوب بنالو تو پھر دنیا میں تم ہی تم ہو۔ بلا کسی جنگ و جدل کے بلا کسی شور و شر کے ایک دنیا تمہارے پیچھے لگ جائیگی۔ تمہارے ہاتھ بیشک تلوار سے خالی ہوں لیکن اہل تلوار تمہارے حلقہ بگوش ہونگے۔ ایک انسان جب ان منازل اخلاق کو طے کر لیتا ہے تو اس میں شان الوہیت پیدا ہوتی ہے وہ دنیا میں خدا کا نمایندہ ہوتا ہے خود خدا اُس کے ہاتھ پاؤں ہو جاتا ہے۔ اِس سے یہ مراد نہیں کہ وہ خود خدا بن جاتا ہے بلکہ وہ ایک مُردے اور بیجان کی طرح خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے اُس کے اعضاء و جوارح ایک مشین کی طرح بن جاتے ہیں جس کا پھیرنے والا خود خدا ہوتا ہے۔ اس پر سلوک کی کل راہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ اس دنیا میں رہکر ایک جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ موت اُس کے حق میں۔ ایک جنت سے دوسری جنت میں انتقال کا نام ہو جاتی ہے +

یہ وہ مقام توحید ہے جہاں ایک مسلمان کو جا کر کھڑا ہونا ہے یہ نہایت ہی مشکل مقام ہے لیکن محالات سے نہیں۔ یہ وہ

زندگی ہے کہ جس کے پانے پر انسان ہر موت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ زندگی اس عالم میں اُسی انسان کو ملتی ہے جو اس زندگی میں اپنے پر ایک موت وارد کرتا ہے۔ وہ موت کیا ہے وہ ہوا و ہوس اور جذبات ردیہ کی موت ہے۔ ہمیں بقاء دوام اُس فنا کے بعد حاصل ہوتی ہے جو ہمیں نفسانی خواہشات پر وارد کرنا ہے۔ ہاں یہ موت اُس کے لئے آسان ہو جاتی ہے جس نے اپنے اندر روح ہجرت پیدا کرنے کی غرض سے مختلف قسم کی چھوٹی چھوٹی موتوں کے پیالے پئے ہیں کیونکہ اس راہ میں جبتک انسان کے اندر روح پیدا نہ ہو تب تک وہ گرفتار ہوا و ہوس رہتا ہے جس نے یہ دشوار گذار گھاٹیاں طے کر لیں اُس پر آئندہ کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔ موت سے خواہ وہ کسی رنگ میں ہو ایک انسان کو ڈرنا نہ چاہیئے تم کسی چیز کے منازل ارتقاء اپنے سامنے رکھ لو۔ ہر نئی منزل ترقی کی پیدائش سابقہ منزل کی موت ہے ✦

فناء و بقاء کا مسئلہ بھی اُسی طرح ان معاملات میں عمل کرتا ہے

جیسے دنیا کی اور چیزوں پر اس کا عمل دخل ہے۔ اخلاق کی نئی تعمیر یا مکان روحانیت کا بننا پہلی عمارتوں کا انہدام چاہتا ہے جسطرح منہدم شدہ عمارت کا مصالحہ نئی عمارت کے کام آجاتا ہے ٹھیک اسی صورت پر ہمنے اپنی ایک چیز کو گرا کر دوسری چیز کو بنانا ہے۔ نفس امارہ نے ہمارے اندر جذبات حیوانیہ کے سواد و مصالحہ سے جن عمارات اخلاق فاسدہ کو بنا رکھا ہے ہمیں اُنہیں گرا کر اُسی مصالحہ سے اخلاق فاضلہ کی عمارت تیار کرنا ہے۔ ہاں اس انہدام میں جن کدال اور کندالیوں نے کام دینا ہے وہ خدا کے اسمائے تنزیہیہ ہیں۔ اور جن نقشوں پر عمارت اخلاق و روحانیات کو تیار ہونا ہے وہ اسمائے تحمیدیہ ہیں۔

جن چند اسماء کا اوپر ذکر ہوا ان پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ مسلم سوسائٹی بہت حد تک ان اسماء کے مناسب حال خوبیوں سے معرا ہو چکی ہے۔ بالمقابل صفات مندرجہ بالا کے الٹ پر اگر غور کریں تو پھر جو کج خلقیاں اُن سے پیدا ہوتی ہیں وہ آج اِس قوم کی زیب و زینت ہیں۔ اِس لئے ہمارے مصیبت کے اسباب اور ہماری اصلاح کے علاج دریافت کر لینے کوئی

امر مشکل نہیں۔ اللہ سے منہ موڑنا اور اُسی کی ذات سے رشتہ جوڑنا ہمارے مدّوجزر کا ذمہ وار ہے۔ آج بھی ہمارے اُبھرنے کا اگر کوئی طریق ہے تو صرف مذکورہ بالا معنوں میں توحید پر قائم ہو جانا ہے۔

قرآن کے اس نظام اسمائے الٰہیہ کے دیکھنے سے ایک انسان تحیّر میں آجاتا ہے۔ اور فطرت سلیمہ بول اٹھتی ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ اگر یہ انسانی کتاب ہوتی تو اس کی ترتیب و تنظیم۔ اس کا انداز۔ اس کا رنگ ڈھنگ۔ اور کتب کا سا ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ ایک مصنف مشترکہ خوبیوں میں دوسرے مصنفوں پہ سبقت لے جائے۔ لیکن عامہ حیثیت میں اشتراک لازم ہوتا ہے۔ اور اس اصول سے باہر دنیا کی کوئی کتاب نہیں خواہ وہ مقدس لٹریچر میں سے ہو یا دنیوی ادبیات میں سے لیکن قرآن کریم کا یہ ڈھنگ کل کتب دنیا سے الگ ہے یہاں کُل کی کُل کتاب ایک خدا کی ذات سے وابستہ کر دی گئی ہے قرآن جسے معبود پیش کرتا ہے۔ اُسی کی صفات کے پیدا کرنے

کے لئے پرستاروں کو حکم دیتا ہے۔ خیر و شر حسنات و سیئات کا جب باب کھولتا ہے تو اُن سب کو بھی اسی ذات سے وابستہ کر دیتا ہے جو شرائع۔ حدود۔ عبادات مقرر کرتا ہے اُن سب کو اُسی معبود کے صفات کے متعلق کرتا ہے۔ الغرض جو کچھ بھی اس کتاب میں بیان ہوتا ہے اُن سب کا محور و مرکز ایک ہی ذات ہوتی ہے پھر اُس کے صفات کچھ ایسے جامع مانع بیان ہوتے ہیں کہ انسان اور اس کے معاملات چھوڑ کائنات کا ذرہ ذرہ ان اخلاق و صفات میں محصور ہو جاتا ہے۔ پھر سب سے حیرتناک بات یہ ہے کہ اس کتاب کی تعلیم کا تعلق تو اصنداد مختلف زمانہ سے ہے۔ لیکن خود اس تعلیم کے مختلف حصص میں کوئی اختلاف واقع نہیں ہوتا۔ اگر یہ انسان کی کتاب ہوتی تو اس جامعیت کے ساتھ ممکن نہ تھا کہ یہ کتاب مجموعہ اصنداد نہ بن جاتی۔ لیکن قرآن کا یہ دعوے صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے۔ ولوکان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً اگر یہ کتاب قرآن خدا کیطرف سے نہ ہوتی تو تم اس میں بہت اختلاف پاتے۔ حق الامر بھی یہ

ہی ہے کہ خدا کی طرف سے اگر کتاب ہو تو ایسی ہی ہو اگر مذہب
والہام کا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف وہ خدا کی ذات منوالے
اور دوسری طرف ہر معاملہ انسانی میں اصلاح کی راہ نکالے
تو پھر ان دو فرائض مختلفہ کا ایک جگہ جمع کرنا مسلمتہً اس قدر
مشکل و محال ہے کہ اسلام کے سوا ہر ایک دوسرے مذہب نے
انسان کے مذہبی اور دنیوی معاملات کو ایک دوسرے سے
جدا کر دیا ہے۔ بعض تو اسے اجتماع ضدین سمجھ کر ایک چھوڑ
دوسرے کو اختیار کر بیٹھے ہیں۔ ان کے نزدیک امور دنیا و
مذہب ایک جا نہ ہو سکتے تھے۔ قرآن نے اس دقت کو طے کیا
وہ ایک خدا کی ذات کو منوانے آیا۔ اور انسان کی ہر اصلاح و
بہبودی کو اسی ذات سے وابستہ کر دیا۔ جیسے کہ تفصیلاً ہم اوپر
بیان کر چکے ہیں۔ انسان کا خدا کی تصویر یا رام مورتی بن کر پیدا
ہونا تو اسلام سے پہلے ہی بعض مذاہب نے تعلیم کیا تھا لیکن
قرآن نے نہ صرف اس راز سربستہ کی حقیقت انسان پر منکشف
کی بلکہ اس حقیقت مخفیہ کو عالم شہود میں لے آنے کا طریق بھی

بتلایا۔ یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک چیز کا کمال اس کے مخفی جوہروں کے کامل طور پر ظاہر ہو جانے سے وابستہ ہوتا ہے۔ قرآن نے آکر بتلایا۔ کہ انسان اور حیوان میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ ادراک انسانی استعداداً اخلاق الٰہیہ کا مجموعہ ہے۔ اور اس کی تکمیل نفس سے مراد ان ہی اخلاق کا ظہور نام ہے۔ اب اگر یہ امر حقہ ہے۔ اور ہر ایسے مذہب کو جس نے انسان کو خدا کی تصویر یا رام مورتی تسلیم کیا ہے۔ اس صداقت سے انکار نہیں ہو سکتا تو پھر قرآن کے سوا۔ آج کس کتاب کو خصوصاً اپنی اپنی موجودہ شکل میں خدا کی طرف سے کہلانے کا حق پہنچتا ہے۔ کیونکہ کتاب اللہ کا اس صورت میں یہی فرض ہونا چاہئیے کہ ایک انسا کو اپنی وصایا پر چلا کر اور اپنے تعلیم دادہ اخلاق کا جامہ پہنا کر مظہر خدا بنا دے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ بات وہی کتاب کر سکتی ہے۔ کہ جس نے حسب تصریح بالا اپنی کل کی کل تعلیم کا محور ایک اللہ کو بنایا ہے۔ قرآن ... ہم کو جہاں سے کھولو وہاں اللہ ہی

اللہ نظر آئیگا۔ اور کیا عجیب بات ہے کہ قرآن کا یہ رنگ معناً نہیں لفظاً بھی صحیح ہے کسی اڈیشن یا کتنی ہی سطروں کا قرآن اٹھالو اور اُسے بلا علم و ارادہ جہاں سے چاہو کھول لو تمہیں وہاں خدا کا ذکر نظر آئیگا۔ اس کا نام اس کی کوئی صفت اسکی طرف پھرتی ہوئی کوئی ضمیر تمہیں ہر صفحہ میں نظر آئیگی۔ انسان کی عقل کو کیا ہوگیا ہے کہ جس کتاب کا یہ رنگ ہو یعنی اس کا صفحہ صفحہ خدا کے ذکر سے معمور ہو وہ تو خدا کی کتاب نہ سمجھی جائے اور کتاب استیتھر منشمولہ بائبل کتاب اللہ ٹھیرے جس کے دس تو باب ہوں۔ لیکن جسمیں شروع سے لیکر اخیر تک خدا کا ذکر تک نہ ہو۔ العظمتہ للہ

اسمائے الٰہیہ مندرجہ قرآن کی طرف میں خاصکر فی زمانا مسلم متکلمین کی توجّہ کو پھیرتا ہوں۔ یہ ایک بے بہا خزانہ ہے وہ اس خزانہ کو کھودیں اور یقیناً یاد رکھیں کہ وہ آج بھی اسلام کو اگر ہر رنگ کے خزائن سے معمور کرنا چاہتے ہیں تو وہ سب کے سب خزائن ان ہی اسماء میں مستور ہیں۔ شوکت۔ طاقت

سطوت۔ دولت۔ علم۔ عرفان۔ فضیلت۔ الغرض ہر کسب
انسانی کے کمال پر یہ اسماء حاوی ہیں۔ ان امور کے حصول
کی راہیں۔ ان اسماء میں لکھی پڑی ہیں۔ کتاب مبین یا لوح
محفوظ کی حقیقت کُل کی کُل ان ننانوے ناموں میں مندرج
ہے۔ کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں ان کی خوبو ہے۔ ہوائیں
چلکر وباء زدہ جگہوں کو پاک کرنے کے لئے سبحان کی شان
اگر دکھلاتی ہیں۔ تو ان کا بعض دفعہ طوفانی شکل اختیار کرکے
جہازوں کو غرق کر دینا بڑے بڑے درختوں اور مکانوں
کو اکھیڑ پھینکنا۔ دراصل جباریت۔ اور قہاریت۔ کی شان
میں جلوہ آرا ہوتا ہے۔ یہی ہوائیں درختوں کو بارور کرنے میں
اگر شان ربوبیت دکھلاتی ہیں تو کسی بیمار کو اپنے تازہ انفاس
سے صحت دیکر مظہر شافی ہو جاتی ہیں۔ یہ کیفیات مختلف
خدا کی مخلوقات میں مختلفاً موجود ہیں۔ پھر انسان جس کے اندر
یہ سارے مظاہر قدرت جمع ہو گئے ہیں سمجھ لے کہ وہ مظہر خدا
ہو کر دنیا میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اسی مقصد اعلیٰ کے حاصل

کرنے کے لئے اسلام نے ذکر و فکر کا دروازہ کھولا ہے جو صوفیائے کرام کی جان اور بزرگان دین کا ایمان تھا۔ لیکن آج اُسی کیمیائے سعادت کو متصوفین زمانہ نے بے معنی ورد و وظائف میں بے حقیقت کر دیا +

حمد و تسبیح کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ لیکن اس سے مراد سبحہ شماری نہیں۔ خدائے حمید و سبحان کی ذات ہماری حمد و تسبیح سے بے نیاز ہے۔ اسکا فایدہ اگر ہو سکتا ہے تو انسان کو بشرطیکہ جن اسمائے الٰہیہ کی وہ گنتی کرنا موجب سعادت سمجھ رہا ہے۔ اور اُس کا نام وہ ذکر الٰہی رکھے ہوئے ہے اُس کی بجائے ان اسماء کی حقیقت سے وہ آشنا ہو جائے عربی زبان میں ذکر کے معنی کسی چیز کو یاد کرنا اور اُسے اپنی آنکھ کے سامنے لانا ہوتا ہے۔ فکر سے مراد تدبر، غور، سوچنا وغیرہ ہے۔ اذکار و افکار ماثورہ سے مراد یہ ہے۔ اور قرآن بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہ ہم اسمائے الٰہیہ میں سے کسی اسم کو لے لیں۔ یا اگر اسم ذات کو ہی بغرض ذکر لے لیں

تو بروقت ذکر اُس کی کسی صفت کو سامنے رکھیں جس کا تعلق عبادت کنندہ کی کسی غرض سے ہو۔ مثلاً۔ حُب یا فتوحات کے لئے بعض وقت لوگ اسم ودود۔ فتاح۔ غنی وغیرہ کا وظیفہ شروع کر لیتے ہیں۔ لیکن خالی ان ناموں کے گننے سے کوئی فائدہ حقیقی مرتب نہ ہوگا وہ ان اسماء مبارکہ کو بار بار پڑھیں مگر اس خیال سے کہ اُنہیں ان اسماء کے کوائف پر غور و فکر کرنے کا موقع ملے۔ ان امور کو سوچیں جو ودود یا فتاح کی شان کے شایاں ہوں۔ یعنے وہ کون سے امور ہیں جن کے ہونے سے ودودیت یا فتاحیت کا ظہور ہوتا۔ اور وہ امور کن اسباب سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا ہی وہ باتیں کس طریق پر اور کن راہوں سے ذکر کرنے والے ہیں اُس کے حسب استعداد پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس کے بالمقابل تسبیح پڑھنے والا اُن امور کو بھی ذہن میں لائے جو اُن کے نقیض ہوں۔ وہ اپنے نفس کا بھی احتساب کرے کہ آیا وہ ان امور سے ملوث تو نہیں۔ اور اگر ہے۔ تو کس طریق اور کن راہوں سے وہ ان سے پاک ہو سکتا ہے۔ اس ذکر و فکر کو پھر وہ عملی جا

پہنائے یعنی وہ ودود اور صمد کے شایان حال امور اپنے اندر پیدا کرے۔ اور ان کی مقتضیات کے خلاف امور سے منزہ ہونے کے لئے قدم اُٹھائے۔

یہ صحیح ہے کہ اس قسم کے ذکر فکر کے لئے ایک باریک بین دماغ کی ضرورت ہے۔ ان امور کو سمجھ لینا ہر ایک کا کام نہیں ان کی حقیقت سے کما حقہٗ آشنا ہونا اُسی کی شان ہے۔ جو فطرت انسانی اور دیگر اسرار کائنات کو زیر مطالعہ رکھتا ہے لیکن کوشش پر لہند ہمم سبلنا کا مژدہ موجود ہے۔ خدا خود راستہ دکھلانے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس کی آسان اور نتیجہ خیز راہ تدبر وتفکر قرآن ہے۔ تم جس اسم ربانی کا ذکر کرو اس کے خط و خال سمجھنے کے لئے قرآن کو پڑھو۔ قرآن ہی تمہیں بتلا دیگا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اور کیا نہیں کرنا۔ فہم قرآن کے لئے دوسرے علوم کا جاننا سونے پر سہاگہ کا کام کرتا ہے لیکن سونا بذات خود ہی سونا ہوتا ہے۔ ولقد یسرنا القرآن ہم نے قرآن کو آسان کر دیا، کا سچا اور صحیح مژدہ اسی لئے دیا گیا تھا کہ تمہیں قرآن کی طرف توجہ کرنے کی

رغبت ہو۔ دنیا کی کسی زبان میں کسی کتاب کا ایک غیر اہل زبان کے لئے سمجھ لینا اتنا آسان نہیں جس قدر ایک عجمی کا قرآن کو سمجھ لینا۔ قرآن کا صحیح طور پر لفظی ترجمہ کرنا اگر تمہیں آجائے تو پھر اس کے بطن کا تم پر کھلنا بہت کچھ تقویٰ کو چاہتا ہے۔ اس رنگ میں بھی یہ کتاب دنیا کی کل کتب سے نرالی ہے۔ دنیا کے کسی فلسفہ یا حکمت کی کتاب کو سمجھ لینا تو بہت حد تک دیگر علوم متعلقہ کی تحصیل پر منحصر ہوتا ہے لیکن قرآن کے غوامض اور اس کی شریعت کے اسرار ایک متقی پر ہی کھلتے ہیں۔ طہارت و تقویٰ ہی قرآنی علوم کی کنجی ہے۔ واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ (متقی کا معلم خود خدا ہوتا ہے) اور لا یمسہ الا المطہرون اس امر کی تصدیق کرتے ہیں تم قرآن پر تدبر و غور کرو۔ قرآن خود ہی اپنی تفسیر ہے۔ یہ خود ہی تم پر ظاہر کر دیگا۔ کہ کسی اسم حسنہ کے مناسب حال کونسی نیکی کون سے اخلاق ہم نے اپنے میں پیدا کرنے ہیں۔ اور انکے خلاف کونسی بدیاں ہیں جن سے ہمیں بچنا ہے۔ پھر اگر کسی غلطی میں

ہم پڑے ہوئے ہیں تو اُس اسم کے مناسب حال کونسی راہ اُس غلطی سے نکلنے کی ہے۔ مثلاً خدا کے یہ تین نام۔ رحمن۔ رحیم مالک یوم الدین جو اسم رب کی ایک تفسیر ہیں ان کے متعلق ہمیں سب سے اول ان کے معانی پر غور کرنا ہے۔ رب کے چار معنی قرآن سے نظر آتے ہیں۔ ایک چیز کا پیدا کرنا۔ اُس کو قایم رکھنا اس کے قیام کے لئے مایحتاج کا انتظام کرنا پھر اس چیز کو ان راہوں سے گذارنا کہ جن میں سے ہو کر اس میں کے ودیعت شدہ جوہر اپنے کامل نشو و نما کو پہنچ جائیں یعنی ایک طرف کسی چیز کو پیدا کر کے اس میں استعدادیں رکھدینا۔ اور پھر ان استعدادوں کو تکمیل تک پہنچانا۔ اور ان دو منازل کے درمیان ہر منزل کے مناسب حال دفع ضرورت کے اسباب پیدا کرنا چنانچہ ربوبیت کی ان مختلف مثالوں کے مناسب حال ہی یہ صفات الٰہیہ ہیں۔ بدیع۔ باری۔ خالق مصور قیوم۔ رزاق وغیرہ وغیرہ۔ اس میں اشارہ ہے کہ تم بھی جو کام کرو اس کی تکمیل کے لئے ان چاروں امور کو سامنے رکھ لو۔ اور

کسی چیز کے بنانے سے پہلے ان چاروں امور کا خیال کر لو اسی طرح ان امورِ ربوبیت کے مناسب حال شان رحمٰنیت یہ ہے کہ ہر ضرورت متعلقہ کے پیدا ہونے سے پہلے اُسی کے دفیعہ کے اسباب موجود ہوں رحمٰن اگر شان وہابیت میں تمہارے نفع کی چیزیں تمہارے بغیر استحقاق تمہیں دیدیتا ہے تو شان رؤفیت میں تمہاری آنیوالی تکلیف کی سپر پہلے ہی سے پیدا کر رکھتا ہے ۔ اب شان رحیمیت یہ ہے کہ جب انسان خدا کے پیدا کردہ اسبابوں کو استعمال کرے تو خدا کی طرف سے اس کے نتائج اس کے ایک عمل کے مقابل کئی گُنا ہوں اسی اصول کے مطابق اگر انسان دوسروں کی مزدوری ادا کرنے میں ساعی ہو۔ تو آج یہ دنیا بہشت ہو جاتی ہے ۔ دوسروں کے گناہ بخشنے میں اسی شان رحیمیت کے مناسب حال عَفُو غَفُور غفّار ۔ واقع ہوئے ہیں ۔ مالک یوم الدین میں جہاں بحیثیت مالکیت ۔ جبّار ۔ متکبّر ۔ ملیک ۔ مقتدر وغیرہ کا رنگ ہے ۔ وہاں جزا سزا کے معاملہ میں قرآن نے مالک کے اور نام

عدل۔ قابل التوبہ۔ غافر الذنب۔ ستار وغیرہ تجویز کئے ہیں۔ یعنی ہر ایک شخص کے اچھے یا برے عمل کے بالمقابل نتائج مرتب کرنا۔ نیک عمل کا عوضہ ایک یا ایک سے زیادہ دینا۔ لیکن بدی کو کبھی چھوڑ دینا یا جس قدر بدی ہو۔ ٹھیک اُس کے مطابق اس کا عوضہ دینا۔ یعنی مالکیت کا ایک رنگ عدل تو ہے۔ لیکن نیک عمل کے مقابل عدل پر رحم غالب آ جاتا ہے۔ اور بدعمل پر عدل کی جگہ بعض وقت غفران اور ستاریت اپنا جلوہ دکھلاتی ہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ ہے کہ ہم نے بھی اپنے معاملات میں ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنا ہے۔ ان ہی کے مناسب حال ہم نے اپنے معاملات دوسروں کے ساتھ طے کرنے ہیں ان ہی کے ماتحت ہم نے بدیوں سے بچنا ہے۔ اور اگر کسی اور سے غلطی یا گناہ ہو جائے تو اس وقت ہمیں کیا کرنا ہے۔ یہی وہ تین باتیں ہیں جن پر علی العموم کسی سوسائٹی کی کل چلتی ہے یعنی ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہمیں کیا نہیں کرنا ہے کسی دوسرے کی

بدی پر ہمارا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیئے؟

قربان جاؤں قرآن کے کس خوبصورتی سے ان تین باتوں کو ان ہی تین صفات کے ماتحت کر دیا ہے۔ فرمایا ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربی وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی۔ والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین امورِ حسنہ میں ہمیں سب سے اول عدل کو مدنظر رکھنا ہے یعنی کسی اور کے عمل پر جو حق ہمارے برخلاف اس کو پیدا ہو گیا ہے۔ اس حق کی عزت کرنا۔ اس کو ادا کرنا یہ شان عدل ہے۔ جو خدا کی صفت۔ عدل۔ یا مالک یوم الدین کا تقاضہ ہے۔ کل معاہدات کل ذمہ واریاں۔ کل امانات۔ الغرض دنیا کے معاملات سلجھانے کے لئے ایک عدل کی منشاء کے ماتحت اپنا طریق عمل رکھنا کافی ہے۔ عدالہائے دیوانی میں جس قدر معاملات آتے ہیں وہ سب کے سب اسی صفت عدل سے وابستہ ہیں لیکن یہ ایک ادنیٰ خوبی ہے۔ شان رحیمیت ہم سے کچھ اور مانگتی ہے

عدل کے ماتحت تو ہم نے کسی ایک فعل کے بالمقابل ایک عوضہ دیا۔ مگر ہمیں چاہیئے کہ ہمارا معاوضہ کسی کے ادنےٰ سے ادنےٰ فعل پر کئی گُنا ہو۔ اس کا نام قرآن نے احسان رکھا ہے۔ اس احسان کا ظہور بھی ایک نہ ایک معاوضہ کے رنگ میں ہوتا ہے۔ گو جس کے معاوضہ میں یہ ہو وہ چیز کتنی ہی بے حقیقت کیوں نہ ہو۔ مثلاً کسی دوست۔ آشنا۔ رشتہ دار سے مروت و احسان کرنا بھی تعلق کا ایک بدلہ ہوتا ہے۔ جس طرح خدا کی شان مالکیت و رحیمیت کا ظہور مختلف درجات میں کسی کے فعل کا ہی بدل ہوتا ہے۔ ٹھیک وہ ہی رنگ امور عدل و احسان میں ہم سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی شان رحمانیت کسی عوضہ میں نہیں ہوتی۔ نہ اُس کا ظہور کسی کے حقوق چاہتا ہے۔ فضل رحمانیت فی الجملہ کسی قسم کا شکریہ یا عوضہ نہیں چاہتا۔ ہم نے بھی اس صفت کے ماتحت اسی قسم کی نیکی اوروں سے کرنا ہے۔ اور یہ وہی نیکی ہے جس کا ظہور ایک خاندان کے مختلف ممبر ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ باپ کا بیٹے

سے یا بیٹے کا باپ سے حسن سلوک ۔ یا بھائی کے بھائی سے
مراعات نہ کسی امر کے معاوضہ میں ہوتے ہیں نہ وہاں ضرورت
شکریہ ہوتی ہے ۔ یہ تین قسم کے حسنات ہیں جن کی قرآن میں سفارش
کرتا ہے! اور یہ تینوں حسنات مالکیت ۔ رحیمیت ۔ اور رحمانیت
کے آثار و اظلال ہیں ۔ یعنی ایک امر کے عوض ایک امر کرنا ۔ دوسرا
ایک امر کے بالمقابل کئی گنا معاوضہ دیدینا ۔ تیسرا بلا کسی عوضہ
و استحقاق کے دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا ۔ یعنی کل دنیا سے
اسی قسم کا حسن سلوک کرنا جیسے ہم اپنے کنبہ سے کیا کرتے ہیں ؛
جو تین قسم کی بدیاں ان ہی تین صفات باری کے منافی
پڑی ہوئی ہیں اُسے قرآن نے فحشاء ۔ منکر اور بغی کے نام
سے پکارا ہے ۔ کچھ حقوق ہم پر ہمارے نفس کے ہوتے ہیں
ایسا ہی دوسروں کے ساتھ معاملات کرنے سے کچھ اُن کے
حقوق اور ذمہ واریاں ہم پر عاید ہو جاتی ہیں ۔ ان حقوق کو توڑنے
کا نام فحش ہے ۔ جس کے خلاف خدا کی صفت عدل ہے جو
مالکیت کی ایک صورت ہے ۔ مثلاً دروغگوئی ۔ زنا ۔ فسق

عہد۔بہتان۔ بد دیانتی۔خیانت وغیرہ وغیرہ حتی کہ کنجوسی عضہ پر قابو نہ پانا بروئے تعلیم قرآن بھی فحش ہے۔ ان حقوق متقابلہ کے علاوہ ہر ایک انسان کے بحیثیت انسان اور ایسا ہی بحیثیت ممبر سوسائٹی بعض حقوق ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر ایک انسان کو حق حاصل ہے کہ اُس کی جان و مال محفوظ رہے۔ یہ حقوق ادنےٰ سے ادنےٰ تعلق سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حقوق ہمسائیگی کسی بالمقابل معاملہ کا نتیجہ نہیں ہوتا کسی کا ہمسایہ ہونا ہی اس کو وہ حقوق دیدیتا ہے۔ ہر ایسا فعل بد جس سے ان حقوق کا نقص یا انکار ہو قرآن کی اصطلاح میں امر منکر کہلاتا ہے اور یہ شان جمیعت کے ٹھیک بالمقابل منافی واقع ہوا ہے۔ ایک فاقہ زدہ ہمسایہ سے مروت کرنا کسی عدل کے ماتحت نہیں ہوتا بلکہ خدائے رحیم کی اطاعت میں ہمارا اُسے کچھ دینا ایک احسان ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر ہم اپنے گھر میں بیٹھکر کسی قسم کی شرارت کریں جو اس کی ایذا کا موجب تو ہو لیکن جس کو روکنے کا اُسے قانوناً یا بتقاضائے عدل کوئی

حق نہ ہو تو اس حالت میں ہم حق ہمسائیگی کا خون کر رہے ہیں۔ اور یہ ایک امر منکر ہے چوری۔ ڈکیتی کسی کی منکوحہ سے تعلق ناجائز، قتل وغیرہ یہ سب امور بھی امور منکرہ ہیں۔ لیکن ان کا تعلق بھی فواحش کی طرح افراد مختصہ سے ہوتا ہے جس طرح عدل اور احسان کسی نہ کسی تعلق کے عوض میں ہوتے ہیں اسی طرح فحشاء۔ اور منکر بھی کسی نہ کسی رشتہ سے ہی وابستہ ہو جاتے ہیں یعنی جن حقوق کی ادائیگی از روئے عدل ہونی چاہیئے ان کا اتلاف تو فحش ہے۔ اور جو اشخاص مورد احسان ہونے چاہئیں۔ وہاں اتلاف حقوق امور منکرہ ہے ان کے بعد بغاوت آتی ہے جو ان دونوں کے مقابل زیادہ وسیع ہے اس کا اثر کل کی کل سوسائٹی پر پڑتا ہے۔ یعنی وہ امور شنیعہ جن کے ذریعہ ہم ساری سوسائٹی کو مصیبت میں ڈالتے ہیں اور یہ وہ جرائم ہیں جن کا تعلق گورنمنٹ سے ہوتا ہے کیونکہ گورنمنٹ کل سوسائٹی کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اس قسم کے جرائم شان رحمیت کے مخالف ہیں جس طرح فضل رحمیت حق اور غیر حق کسی چیز کو نہیں دیکھتی

اسی طرح باغیانہ امور کا اثر چونکہ ساری سوسائٹی پر پڑتا ہے وہاں بھی حق اور غیر حق کا کوئی سوال نہیں۔ اس کے ارتکاب سے اُن کو بھی تکلیف پہنچتی ہے جو اس کے مستحق نہ تھے۔ ایسا ہی ایک قوم کا دوسری قوم پر بلا وجہ ہوجہ حملہ آور ہونا۔ یا نقض عہد کرکے اُس کے املاک پر قبضہ کر لینا بھی خدا کے ہاں بغاوت ہے۔

اِس کے بعد وہ امور ہیں جن سے دوسروں کی بدعملی کو تعلق ہوتا ہے۔ اور جن پر ہمارا غصہ بھڑک کر ہم سے کسی نہ کسی سختی کا ظہور کرا دیتا ہے۔ ان امور کے انسداد کو قرآن نے صفت مالکیت کے ماتحت رکھا ہے۔ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مالک اگر مملوک کی غلط کاری پر کچھ کرنا چاہے۔ تو ہر حالت میں اسکی مالکیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ مملوک سے ایسا سلوک نہ کرے جس سے وہ ضائع ہو جائے کیونکہ اِس سے اُس کی اپنی مالکیت ضائع ہوتی ہے۔ لہذا مملوک کی غلطی پر مالک کا مقصد اصلاح ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے ہمیں ہدایت

کی ہے کہ ہم بھی بدی کے مقابل جو امر کریں اس میں اصلاح مقصود ہو۔ اگر تو بدی کے عوض بدی کرنے میں انسداد بدی ہوتا ہو تو صفت عدل کے ماتحت بدی کا علاج بدی سے کرے۔ لیکن اگر معاف کر دینے سے بدعمل اصلاح پا جائے تو مالک یوم الدین کی شان غفران کے ماتحت معاف کر دینا چاہیئے جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا فمن عفی واصلح فاجرہ علی اللہ۔ (بدی کے مقابل اسی نسبت سے بدی کرنا صحیح ہے۔ لیکن اگر عفو باعث اصلاح ہو جائے تو تم غفور الرحیم خدا کی منشا کو پورا کرو) یہ تو انسداد بدی کا علاج بتلایا گیا ہے لیکن غضب کے بھڑکنے کا مقام ایک اور بھی ہے۔ جہاں بدی یا غلطی کا مرتکب ہمارے ماتحت یا دست نگر ہوتا ہے۔ یہاں غضب بے طور بھڑک اٹھتا ہے۔ اور یہی وہ موقعہ ہے جہاں قوت غضبی کی اصلاح ہونی چاہیئے۔ اس لئے ایسے موقعہ پر غصہ کے دبا ڈالنے کا حکم ہمکو قرآن نے دیا ہے یعنی ہم مالک یوم الدین کی صفت غفران کو استعمال کریں۔ مگر صرف غصہ کا دبا ڈالنا ہمارے دل کو

خطا کنندہ کی طرف سے صاف نہیں کرتا ہم اُس کے اعتراف غلطی پر نہ صرف برنگ مالکیت غصہ کو چھوڑ دیں بلکہ اس سے بھی آگے قدم رکھیں۔ ہم رحیمیت کے رنگ میں اُسے معاف بھی کر دیں۔ ہاں اس موقعہ پر اگر اُسے کچھ بخشش بھی کریں تو ہم سے وہ رنگ رحمٰنیت ظاہر ہوگا جس کا فضل ایک کافر و منکر ہستی باریتعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ الغرض مالکیت ۔ رحیمیت ۔ رحمٰنیت کے مناسب حال ان تین مدارج کو قرآن نے الفاظ ذیل میں بیان کیا ہے والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین۔

آثار میں آیا ہے کہ ہر انسان کا شیطان اُس کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن آنحضرتؐ کا شیطان پیدا ہوتے ہی مسلمان تھا۔ ایسا ہی اللہ تعالیٰ کا کامل بندہ ہو جانے پر بھی کسی شخص کا شیطان مسلمان ہو جاتا ہے۔ یہ انجیلی قصہ کہانیاں نہیں بلکہ حقائق حکمیہ ہیں۔ غضب ہی ایک چیز ہے جس کی آگ بھڑکانے میں شیطان کو خلقی مناسبت ہے۔ ہم اپنے مقابل کسی طاقتور پر غصہ کا پورا اظہار نہیں کر سکتے۔ بلکہ بعض وقت ہمیں اسکی

سخت غلطی پر بھی خاموش ہی ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ہمارے
غضب کا محرک کوئی عاجز مسکین انسان اور خصوصًا کوئی اپنا
دست نگر نوکر ہو تو پھر ہمارے غضب کی جولانی کسی حدود کا
لحاظ نہیں کرتی۔ اُس وقت ہم اپنے ہمزاد شیطان کے قبضہ
میں ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ جو چاہے ہم سے کرالے۔ لیکن یہی
وہ موقعہ ہے۔ اگر ہم مالکیت۔ رحیمیت اور رحمٰنیت کا رنگ
بتدریج اپنے اندر پیدا کرلیں یعنی قرآن کی آیت بالا پر عمل کر کے
نہ صرف غضب کو کھا ہی جائیں بلکہ اُسے معاف بھی کریں
اور کچھ اس کے ساتھ احسان بھی کریں۔ تو ہمارا شیطان نہ
صرف مسلمان ہی ہو جائیگا بلکہ ولی ہو سکتا ہے۔ چور کو قطب
مردانِ خدا اسی طرح بنا دیا کرتے ہیں۔ اس امر پر غور کرنے
سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن نے سلوک کے مشکل سے
مشکل مقامات کیسی آسان راہوں سے گذار دیئے ہیں۔ انسان
میں رحمٰنیت کا رنگ پیدا ہونا کوئی چھوٹی سی بات نہیں یہ
وہ بلند مقام ہے کہ جہاں پہنچکر انسان خدائے تعالےٰ سے

ہمکلام ہو جاتا ہے۔ جیسے الرحمن علم القرآن میں اس بات کا
اشارہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ایک انسان دوسروں
کے لئے ذریعہ ورود افضال رحمنیت ہو جاتا ہے۔ یہ مقام اسی
شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کے کل قوئی اور مکسوبات بلا
استحقاق اوروں کے لئے وقف ہو جاتے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ
کے عطیات کا رب العالمین کی مخلوق کے لئے امین ہوتا ہے
اس کی اپنی ہی پیدا کردہ چیزوں کے ساتھ اسے کوئی تعلق نہیں
ہوتا اس کا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا اس کی عبادات اس کی رنج
وراحت سب رب العالمین کی منشاء کے تلے آجاتا ہے
اس شان کا مظہر اتم تو وہی ذات اقدس تھی جس کے ایسے
ہونے کی شہادت خود قرآن نے دی۔ قل ان صلوتی ونسکی
ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لاشریک لہ و
بذالک امرت وانا اول المسلمین۔ مگر یہ دروازہ کم وبیش
ہر انسان پر کھلا ہے۔ اس کی راہیں قرآن کی آیات میں موجود
ہیں لیکن جو بات نہایت حیران کردینے والی ہے وہ یہ ہے

دوسرے مذاہب نے اس مقام پر پہنچنے کے لئے جہاں مختلف قسم کی کوہکنیاں جنگل نواسیاں طرح طرح کی نفس کشیاں اور ریاضتیں تجویز کی ہیں وہاں قرآن نے فطرتِ انسانی کو سامنے رکھکر انسان کی روزانہ زندگی میں اُن چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے لیا کہ جن پر عمل کرنا بھی بہت دشوار نہ ہو۔ یہ چھوٹے چھوٹے امر آہستہ آہستہ انسان کی فطرت میں اخلاق عالیہ پیدا کر دیں۔ چنانچہ سورہ الفرقان میں عبادالرحمٰن کا نقشہ کھینچتے ہوئے قرآن بہت سی ایسی باتوں کا ذکر کرتا ہے جو انسان کی روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُسے ایسے مواقع پر نیکی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ جہاں وہ اس نیکی کو بلا کسی تکلیف کے کر تو گذرے۔ مگر اُس کا ظہور کسی ایسے شخص کے مقابل ہو جو نہ صرف اس نیک سلوک کا مستحق ہی نہیں بلکہ وکھی قسم کی بدسلوکی کا مستوجب ہی ہو۔ مثلاً فرمایا ہے اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما جب رحمٰن کے بندوں سے لوگ جہالت سے پیش آتے ہیں تو وہ نہ صرف درگذر ہی کرتے ہیں بلکہ اُن پر اسلام بھی

بھیجتے ہیں جو زندگی کے مختلف مواقع ناگوار حالات کو نہ صرف صبر کے ساتھ گذارنا سکھلاتے ہیں۔ بلکہ یہ چھوٹی چھوٹی حسنات آخر کار ہمیں خلق رحمٰنیت کے خلعت سے ملبوس کر کے ہمیں خدا کا مظہر بنا دیتی ہیں۔

الغرض قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی کوئی شان ایسی نہیں بتلائی کہ جس کے ماتحت صبغۃ اللہ بننے کا طریق بھی نہ بتلا دیا ہو ہاں تدبر فی القرآن شرط ہے۔ خصوصًا حل مشکلات کے لئے قرآن نے اسی راہ کی سفارش کی ہے۔ آج جو ہم طرح طرح کی مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں اس کا علاج بھی کیوں قرآن سے تلاش نہیں کرتے۔ اس کا ایک علاج یہ ہے کہ تم خدا کے اسماء کا ذکر کرو جس کے لئے بہترین وقت پچھلی رات ہے۔ ان اسماء کے متعلق تفکر کے لئے اس وقت قرآن پڑھو پھر قرآن کی روشنی میں اپنے قول و فعل کو درست کرو۔ جو مشکل یا جو ضرورت تمہارے سامنے ہو اس کے مناسب حال اسم رب سے لو اور یاد رکھو کہ اسم رب کے ماتحت بہت سے اسماء آجاتے ہیں

ان کی کوائف سے آشنا ہونا اسم رب کا گویا ذکر و فکر ہے رحمانیت۔ رحیمیت اور مالکیت بھی ایک معنی میں اسم رب کی تفسیر ہے۔ الغرض ان سارے کوائف سے واقفیت اور ان کوائف سے مکیف ہونے کی راہیں تمہیں قرآن دیگا چنانچہ سورۂ مزمل جو بہت ہی ابتدائی سورۃ ہے مکی مشکلات کے سرانجام کی راہ ذیل کے الفاظ میں تعلیم کرتی ہے۔ یا ایھا المزمل قم اللیل الا قلیلا نصفہ او انقص منہ قلیلا او زد علیہ و رتل القرآن ترتیلا۔ انا سنلقی علیک قولا ثقیلا۔ ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطأ و اقوم قیلا۔ ان لک فی النہار سبحا طویلا و اذکر اسم ربک و تبتل الیہ تبتیلا۔ رب المشرق و المغرب لا الہ الا ھو فاتخذہ وکیلا۔ ان آیات سے آگے قرآن اُن دشمنان حق کا ذکر کرتا ہے جو اسلام کو اُس کے پیدا ہوتے ہی کچلنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ جن کے ہاتھ اور اُن کی زبان سے اسلام اُس وقت امن میں نہ تھا۔ آج اگر مسلمان یہ سمجھ رہے ہیں کہ

اِس وقت اسلام پربھی زلزلے کے دن ہیں۔ اسلام پھر دوسروں کی زبان و ہاتھ سے امن میں نہیں تو جو کچھ آج حامیان اسلام کر رہے ہیں۔ خدا اُنہیں اُن کی نیات کے مطابق نتیجہ دیگا لیکن میں اُنہیں بڑے زور کیساتھ اس سورۃ شریف کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ اگر اُن کے دن مختلف قسم کی مصروفیتوں میں کٹ جاتے ہیں تو خود خدا اُنہیں ان لک فی النہار سبحاً طویلا میں ایسی رخصت دیتا ہے۔ لیکن خدا رادہ مردان خدا نہیں۔ اپنے بستروں کو آدھی رات یا (ثلثی الیل) دو تہائی رات کے بعد چھوڑ دیں۔ وہ اُس وقت عدم تعاون۔ ترک موالات۔ سیتیا گرہ۔ یا اُن تمام راہوں کو قطعاً سر سے نکال دیں جو آجکل پولیٹیکل اکھاڑوں کے لڑویئے تجویز کیا کرتے ہیں۔ جب وہ تہجد کے لئے حکم باری کے ماتحت اٹھیں تو پھر وہ اُس وقت وہی باتیں کریں جو قرآن بتلاتا ہے۔ اور وہ یہ ہیں کہ وہ فاتخذہ وکیلا۔ یعنی خدا کو اپنا محافظ سمجھیں ترک موالات کی بھی حقیقت یہی ہے۔ کہ کفار چھوڑ انسان کسی کو اپنا

ولی و وکیل نہ جانے۔ تمہارے بزرگوں نے جو لاالہ الا اللہ کے ورد کی تمہیں ہدایت کی ہے۔ تو اس کا ماخذ سورۃ مزمل کی یہی آیت ہے۔ رب المشرق والمغرب لا الٰہ الا ھو فاتخذہ وکیلا۔ جو مشرق و مغرب کا رب ہو اس کی پناہ تلے آجانا اسی وقت ہوتا ہے۔ جب ماسواء للہ سے انسان مُنہ موڑے یہاں لاالہ الا اللہ کا اشارہ کرکے تمہیں ترک موالات کا معراج بتلایا گیا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا تم کسی کو ولی نہ جانو ان آیات بالا کے مطالب پر غور کرنے سے تمہیں سمجھ آجائیگا کہ تہجد کے وقت نوافل کے بعد تسبیح لاالہ الا اللہ کا کیا اندازہ ہونا چاہئیے واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا۔ اسم رب کا تو ذکر کرنا اور اس کے ساتھ تبتل تام کا ہونا اسی وقت ہوگا کہ جس وقت تمہاری کُل توجہ کو اسم رب اپنی طرف کھینچ لے یعنی تم ہر ایک ایسی چیز سے جو منافی شان ربوبیت ہو انقطاع تام کرو اور ہر ایک ایسی چیز کو حاصل کرو جس کا مطالبہ شان ربوبیت کرے اس کے سوا تبتل تام ہونا ناممکن ہے اور

ذکر کی تکمیل اگر ہو سکتی ہے تو اسی قسم کے تبتل سے ہو سکتی ہے
ہاں امور متقاضی و منافی ربوبیت کا علم ایک سالک کو کیسے
ہو۔ اُس کے لئے فرمایا قم الیل۔ ورتل القرآن ترتیلا یعنی
پچھلی رات اٹھو اور قرآن کو آہستہ آہستہ پڑھو۔ تاکہ تمہیں
اُس پر غور و فکر کا موقعہ ملے۔ پھر اسی صورت میں تہجد کے
لئے اُٹھنے کا حکم دے کر فاقرءوا ما تیسر من القرآن کا حکم
دینا پھر ایک اور مقام پر تہجد کی تاکید کر کے نفلوں کے
ساتھ ان قرآن الفجر کان مشھودا کا اشارہ فرمانا۔ یہ
سب باتیں تمہیں بتلاتی ہیں۔ کہ مقصد تہجد صرف نوافل
پڑھنے یا لا الہ الا اللہ یا کسی اور اسم پاک کے ورد و وظیفہ
کرنے سے فقط حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ تمہیں اسم رب کا
ذکر کرنا ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ اسم رب قریب قریب
سارے کے سارے اسماء حسنیٰ کا قائم مقام ہو جاتا ہے
یعنی ان اسماء کو یاد کرنا اور ان کی منشاؤں کو تلاش کرنا اور اس
تلاش کے لئے تلاوت قرآن کرنا یہ وہ راستہ ہے جس سے

مشکلات کے پہاڑ ٹل جاتے ہیں۔ کیا تم یہ سمجھے ہوئے ہو کہ پبلک جلسے کرنا اور پبلک جلسوں میں کھڑے ہو کر اُن کو بُرے الفاظ سے یاد کرنا جنہیں تم اپنے مقاصد کا مخالف سمجھتے ہو ان سے ہمارے معاملات سُلجھ جائینگے۔ کس قدر دردناک منظر ہے۔ اسلامی جلسوں میں زیب و زینت آج دوسروں کو گالیاں دینا ہوتا ہے۔ ہم میں سے جو چاہے آج آسانی سے اس طریق پر ہمارا لیڈر ہو سکتا ہے۔ اگر وہ پبلک میں کھڑے ہو کر گورنمنٹ کو یا کسی اور آدمی کو بُرے الفاظ سے یاد کرنے کی جرأت رکھتا ہو۔ اور اگر اِن باتوں کی پاداش میں وہ ایک دفعہ جیل دیکھ آئے تو پھر اُسے لیڈری کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔ میں نہ پبلک جلسوں کا مخالف ہوں نہ صحیح طریق پر ایجی ٹیشنوں کو بُرا جانتا ہوں۔ یہ تو اسلامی شعار ہے۔ گورنمنٹ کو اُس کی غلطیوں سے اطلاع دینا۔ بقول پیغمبرؑ جہاد اعظم ہے لیکن بروقت جلسہ بیہودہ سرائی کرنا۔ بدکلامی یا بددعائیں ہونہ سے نکالنا وقار اسلام کے خلاف ہے۔ دیکھو

اس کے متعلق قرآن کریم اسی سورۃ مزمل میں تمہیں کیا کہتا ہے
واصبر علیٰ ما یقولون واھجرھم ھجراً جمیلا۔ وذرنی
والمکذبین اولی النعمہ ومھلھم قلیلا۔ یہ حکم جس کو ہوتا
ہے اس کے اردگرد ظلم۔ استبداد کینہ جفا کاری کی جو حد
تھی۔ اس کا تو عشر عشیر ہمارے اردگرد نہیں پھر اسے جس
بات کا حکم ہوتا ہے وہ کیوں ہم پر حاوی نہیں۔ تم اپنے اندر
وقار پیدا کرو۔ صبر اولوالعزمی۔ ہمت۔ استقامت۔ بلند
نظری۔ تمہاری زیب وزینت ہو۔ ان باتوں میں جو رعب
ووقار ہوتا ہے۔ وہ جلسوں میں کھڑے ہوکر گالیاں دینے
سے نہیں ہوتا۔ ان آیات میں تمہیں دو باتوں کا حکم خدا تعالےٰ
دیتے ہیں۔ ایک کام کو تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ اور
دوسرے کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ ہمارے سپرد کردو۔
تمہارا یہ کام ہے کہ تم راتوں کو اٹھو۔ نفل پڑھو۔ جو امر مہمہ تمہارے
سامنے ہو اسی کے مناسب حال اسم حسنہ کی تلاش کرو بطریق
بالا اس کا ذکر کرو۔ اس اسم کے مقتضیات ومنافیات کے

لئے قرآن پر غور کرو۔ پھر جو تمہیں قرآن ہدایت کرے اُس کے
مطابق تبتل تام اور انقطاع الی اللہ کرو۔ اُس وقت رب
السمٰوات والارض تمہارا وکیل و حامی ہوجائیگا۔ پھر جو تم چاہو گے
وہ ہوجائیگا۔ پھر جو تم چاہو گے وہ ہوجائیگا۔ الغرض تمہاری
راتیں اس طرح گذریں اور تمہارے دن اُن امور کی تعمیل
میں گذریں جو تمہارے شبینہ اذکار و افکار نیمہ منکشف کریں
آج بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم میں سے ایک جماعت
اس کام پر معمور ہو۔ سورۃ مزمل کے دوسرے رکوع میں اس
طرف صریح اشارہ ہے۔ وطائفۃ من الذین معك کی
منشاء یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کی مختلف جماعتیں مختلف امور
میں مصروف ہوں۔ اُن میں ایک جماعت قومی مقاصد کے
لئے قائم اللیل ہو۔ آج بھی دنیا شب بیداروں سے خالی نہیں
لیکن بد قسمتی سے ان میں کا زیادہ سے زیادہ حصہ مقاصد ذاتی
کو اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اپنے نفس کی اصلاح یا اپنے
ضروریات کے حاصل کرنے کو یہ لوگ خدا کے سامنے کھڑے

ہو جاتے ہیں۔ بعض جو عجائب پرستوں کا مرکز بننا چاہتے ہیں وہ علم توجہ کے پیچھے ہوئے ہیں۔ ہم اُن پر نکتہ چینی نہیں کرتے لیکن ضرورت حاضرہ ہم سے یہ باتیں کہلوا رہی ہے۔ وہ جن باتوں کو اپنا مایۂ ناز سمجھتے ہیں، اور جو اُن کے یا اُن کے پیروؤں کے زعم میں اُنہیں قبۂ دین بنا رہی ہے۔ وہ باتیں آج مغربی بازار اکتساب میں کوڑیوں کے مول بِک رہی ہیں۔ کشف قلوب۔ تسخیر۔ سلب امراض۔ حلقہ بندی۔ دل کا جاری کرنا۔ بروقت حلقہ حاضرین کے دل میں ایک سرور کی لہر کا اٹھانا۔ حضور فی الشیخ۔ ملاقات ارواح۔ ان سب کی دوکانیں آج امریکہ۔ اور اُس کے بعد یورپ میں کھل رہی ہیں میں نے خود تجربتہً ایسے حلقوں میں بیٹھ کر کیفیات کو محسوس کیا ہے۔ اور عجیب بات ایک یہ ہے کہ یہ سرور ہمارے یہاں کے سرور حلقہ بندی سے کچھ جدا نہ تھا۔ میں نے اِن کے متعلق اس لئے لفظ دُکان استعمال کیا ہے کہ اپنے یہاں یہ باتیں تو ایک حد تک للّٰہیت کے رنگ میں ہوتی ہیں۔ لیکن مغرب میں یہ

سب چیزیں داموں بکتی ہیں۔ اس موقعہ پر اپنے یہاں کے ان کمالات ہیں اور یورپ کے ان اکتسابات میں فرق کرنا یا صحت و عدم روایت پر بحث کرنا۔ یا ایک کا نام استدراج اور دوسرے کا نام کرامت رکھنا۔ یہ سب بے ضرورت باتیں ہیں۔ ایک منزل پر پہنچنے کے مختلف راستے ہوتے ہیں کوئی لمبا۔ کوئی سیدھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ یہ منزل منزل مقصود نہیں۔ سالک کی منزل بہت دور ہے۔ ہاں وہاں تک پہنچنے میں جن ابتدائی منازل میں سے ہو کر اسے گذرنا ہے ان کی یہ سیر اور تفرجگاہیں ہیں۔ جہاں کافر مومن دونوں پہنچ جاتے ہیں۔ جو بات دونوں میں فارق ہے وہ سالک کی غرض و غایت ہوتی ہے۔ ایک کافر یا ایک شعبدہ باز کی جو منتہی ہوتی ہے وہ سالک کا پہلا قدم ہے۔ ہاں سالک انہیں لہو ولعب سمجھ کر ان میں گرفتار نہیں ہوتا۔ وہ ان سے مونہہ موڑ کر قدم آگے بڑھاتا ہے۔ بعض لوگ ان ابتدائی منازل کی نیرنگیوں میں پڑ جاتے ہیں۔ عجوبہ پرستوں کا ایک

گروہ اُن کے ساتھ ہو جاتا ہے جن کی ارادتمندیاں ان لوگوں میں عجب وغرور بڑھا کر ان کی بھی ترقی روک دیتے ہیں اور ان کے مریدین کی بھی رفتار ختم ہو جاتی ہے۔ سرور اور حظ قلب نے آج بہت حد تک دنیا کو دھوکہ دے رکھا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ جہاں یہ عبادت کی رُوح ہے دوسری طرف یہی کیفیت اور اسباب سے بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ گانا بجانا۔ اشعار۔ قدرت کے منظر۔ بعض قسم کی توجہیں۔ بعض ریاضات۔ ان سب سے قریب ایک ہی قسم کی قلب میں لذت پیدا ہوتی ہے۔ ایک شخص بھجن میں۔ دوسرا شخص قوالی میں۔ تیسرا تغزل میں۔ چوتھا مشرکانہ گیتوں میں جو وہ ایک بت کے سامنے گا رہا ہے۔ ایک ہی قسم کے مزے لیتا رہا ہے۔ یہ امر اُن لوگوں کے قابل غور ہے جو آجکل کے بعض متصوفین کے پاس جا کر اس قسم کی کیفیات قلب محسوس کرنے سے غلطی میں پڑ جاتے ہیں اسلام نے مسجد کو سادہ رکھنے اور عبادت کو ہر قسم کے گانے بجانے سے الگ کر دینے

ہیں یہ ہی مصلحت رکھی کہ یہ چیزیں ایک قائم الصلوۃ کے قلب
میں سرور پیدا کر کے اُسے دھوکے میں نہ ڈالدیں میں نے
خود بعض ہندؤں کو بھجن گاتے ہوئے دیکھا ہے ان کے
دل کی کیفیت جو اُن کے چہرے ان کی آنکھوں۔ بروقت
عبادت اُن کے رنگ و روغن۔ اُن کی محویت سے ظاہر
ہوتی تھی۔ وہ یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ وہ روحانی لذت سے
پورے متمتع ہو رہے ہیں۔ لیکن اُن کا ایک دیوی کے حضور بیٹھنا
اور اُن کے بھجنوں کا شرک سے مملو ہونا جہاں میری حیرت
کا موجب ہوتا تھا۔ وہاں آہستہ آہستہ یہ امور مجھے اس نتیجہ پر
لے آئے کہ یہ لذت روح جہاں صحت عبادت کی ایک وجہ
تمیز ہے۔ وہاں بذات خود یہ کوئی چیز نہیں ہے اس کا پیدا
ہونا۔ اس کے مولد کے جوازیت کا کوئی ثبوت نہیں۔ جسے
ہم کو بذات خود دیکھنا ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط۔ ہاں جب اسکی
صحت ہم پر اور طریقوں سے کھل جائے تو پھر اسپر ہمارا قدم زن
ہو کر اس لذت کو پالینا اس امر کا ثبوت ہو گا کہ وہ بات ہم

صحیح طور پر ادا کر رہے ہیں۔ لذت نماز اس بات کا تو ثبوت ہے کہ ہم نماز صحیح طریق پر ادا کر رہے ہیں لیکن یہ لذت علی وجہ التجرد اس بات کا ثبوت نہیں کہ ایسی چیز جو اس لذت کے باعث ہو وہ بذات خود کوئی بہتر چیز ہے۔ اگر یہی لذت معیا ہے تو تغزل تشبیب۔ ترنم۔ وغیرہ وغیرہ سب معاذ اللہ حیثیت میں نماز کے برابر ہو جائینگے۔ لہذا اسلام نے نماز کو ان تمام باتوں سے الگ کر دیا۔ ایک یہودی۔ ایک عیسائی۔ ایک برہمن۔ اپنی اپنی عبادتگاہوں سے اگر حالت سرور میں نکلے تو اُسے یہ یقین نہیں کر لینا چاہیئے کہ اس کی اس لذت کا موجب خالصتہ عبادت تھی۔ کیونکہ ان عبادتگاہوں میں گانا بجانا۔ عبادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ مگر ایک مسلم اگر نماز میں لذت و سرور حاصل کرلے تو بالضرور اس کی نماز اس کے لئے معراج ہو گی کیونکہ یہ لذت خالصتہً عبادت سے پیدا ہوئی ہے۔ اور عبادت کے سوا اِس سرور و حظ کے پیدا کرنے کی اور کوئی چیز وہاں نہ تھی۔ یہ ساری بحث جو میں نے یہاں کی اُس کی غرض یہ

نہ تھی کہ میں مسلمانوں کو اس سرور کی غلطی سے آگاہ کر کے آجکل کے متصوفین پر کچھ تعریض کروں۔ اس قحط الرجال میں یہ لوگ بھی ایک رنگ میں مفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ لوگ عموماً فواحش سے بچے ہوتے ہیں۔ اور ان کے پاس بیٹھنے والے کم از کم غلط کاریوں سے بچ جاتے ہیں۔ میری اس بحث سے غرض یہ ہے کہ وہ اس سرور اور حظ قلب کو اور قوت توجہ وارادی کے دوسرے کرشموں کو اپنا معراج نہ سمجھ لیں۔ یہ سب کی سب ہیلے حقیقت چیزیں ہیں۔ ہاں چونکہ یہ جماعت۔ رات کو اٹھنا عبادت میں بیٹھنا جانتی ہے اور اس لذت سے آشنا ہو چکی ہے ان لوگوں کے لئے قائم اللیل ہونا مشکل نہیں۔ یہ لوگ اس ہمارے آڑے وقت میں طائفۃ من الذین معک کا مصداق بنیں۔ اس قسم کی توجہوں کو چھوڑ کر وہ اسمائے حسنیٰ کے ذکر و فکر میں لگ جائیں۔ اس جماعت کا شغل جو خود خدا تجویز کرتا ہے وہ اختیار کریں اور وہ یہ ہے فقراؤ ما تیسر من القرآن

جس بات کی ہمیں ضرورت ہے وہ دولت و سلطنت نہیں جس خزانہ

کو ہم کھو بیٹھے ہیں وہ اخلاق فاضلہ اور روحانیات ہیں۔ قوم میں پست
نظری۔ دون ہمتی اور کم ظرفی پیدا ہو گئی ہے۔ انکی نگاہیں چند پیسوں پہ
چند مربع جات زمین پر خطاب اور عہدوں پر محدود ہو گئی ہیں۔ یہ چیزیں
بری نہیں نہ ان کا حاصل کرنا ہی مذموم ہے بلکہ صحیح طریق پر انکا حاصل
کرنا خدا کا فضل سمجھا جا سکتا ہے لیکن اگر اخلاق بیچکر انہیں حاصل کیا
جائے تو پھر یہ سب ہیچ ہے۔ زر و مال اگر بحیثیت خود کوئی چیز ہوتا تو پھر
سودائے فواحش ایک اچھی تجارت ہے لیکن شریفانہ افلاس پر ایک
معمولی عقل کا انسان بھی اس دولتمندی کو قربان کر دیگا۔ یہ تجارت
فواحش ایک خلق کا بیچنا ہے یعنی عصمت فروشی۔ اب اگر عصمت فروشی کے
ذریعہ جاہ و مال کا حاصل کرنا ایک امر کریہہ ہے تو پھر خود داری ہمدردی
قوم جمعیت ملت وغیرہ کو ہاتھ سے دیکر عز و جاہ و خطاب حاصل کر لینا
عصمت فروشی سے ملتی جلتی اخلاق فروشی ہے قوم میں اس وقت
ڈیماریلائزیشن (خفت و تخریب اخلاق) ہو چکی ہے سیرت اور کیریکٹر کا دوالہ
نکل چکا ہے۔ اگر ضرورت ہے تو اس جائداد کے واپس لینے کی ضرورت ہے۔
اس لئے میں قوم کے مشاہیر سے نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ وہ

زیادہ اپنی توجہ اس طرف لگائیں کہ کل کی قوم کا سیاسی پٹری پر چڑھ جانا مفید ہوگا اب پھر بد قسمتی سے ہندوستانی میدان سیاسیات میں نکتہ چینی وانہدام کا رنگ زیادہ ہے اسکی بجائے زیادہ اس چیز کا سامنے رکھنا ضروری ہے جس سے قوم۔ قوم بن جائے کسقدر افسوسناک مقام ہے کہ کچے اخلاق کے نوجوان طالب العلم جو سیاسیات کے نام سے بھی ابھی ناواقف ہیں وہ ان امور میں پڑ جاتے ہیں انہیں سے بعض ممکن ہے میدان سیاسیات کے ہیرو بن جائیں لیکن زیادہ خطرہ یہ ہے کہ انہیں خامی عقل کے باعث بیجا نکتہ چینی کی روح پیدا ہو جاتی ہے بلا سوچے سمجھے اپنے ماحول سے بیزار ہو جاتے ہیں پیش آمدہ مشکلات کے مقابل میں بجائے اسکے کہ یہ لوگ استقامت و تدبر سے کام لیں بھی شکایت سشورش اظہار گھبراہٹ کو ترجیح دینے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ فی الجملہ ان میں شان اولوالعزمی کا کوئی رنگ نہیں رہتا صرف چند رزولیوشن پاس کر کے چند صلوتیں سنا دینا ان کا مایہ ناز ہو جاتا ہے قوم کے لیڈر اس بات پر نہایت حزم واحتیاط سے غور کریں میں اس بات کا معترف ہوں کہ میں اس منزل سیاسیات سے بالکل

نا آشنا ہوں لیکن اس قدر جانتا ہوں کہ آج جس بات کی ہمیں ضرورت ہے
وہ استقامت صبر جرات شجاعت سیر چشمی قناعت تدبر عاقبت
غور و فکر اور دیگر اخلاق حسنہ ہیں سیاسیات یا ایسے وہ امور جن کی انجام
دہی ایک حد تک احتجاج صاف گوئی جرأت اور خطرہ سے لاپرواہی
چاہتی ہے۔ وہ سرد گرم چشیدہ مزاجوں کے ہی مناسب حال ہوتی ہیں
اوائل عمر کے لوگ ان امور میں حصہ لینے سے احتمال ہے کہ شوریدہ سری۔
بیہودہ نکتہ چینی گستاخی۔ مادر پدر آزادگی کے شکار ہو جائیں پھر
جنمیں ایک دفعہ یہ باتیں آگئیں وہ ثبات قدم۔ صبر۔ قناعت۔ خود ضبطی
جیسی قیمتی اخلاق کے وارث نہیں ہو سکتے اور اگر ہماری آنیوالی نسل
میں بھی یہ باتیں نہ رہیں تو پھر کسی قومی فلاح کی امید رکھنا ایک امر موہوم ہو جائیگا
اس امر کے حصول میں بھی توحید ہی ہمیں کام دیگی اور وہ یہ ہے کہ ہم ہر
معاملہ میں کوئی بھی ایسی بات اختیار نہ کریں جو اخلاق الٰہیہ کے موزوں حال
نہ ہو تم اپنی سوسائٹی اور قوم کی بہتر سے بہتر عمارت بنا لوگے اگر اس تعمیر اخلاق
کا مصالحہ جیسے میں نے اوپر لکھا ہے ربّانی اخلاق کے مناسب حال تمہارے
اخلاق ہوں۔ اسمائے حسنیٰ پر غور کرنے سے مجھے جہاں جبار۔ متکبر۔ مذل

مانع ضار منتقم کے اخلاق نظر آسکتے ہیں۔ وہاں انکے مقابل جو اسی سے اوپر اور اسمائے حسنیٰ ہیں گے انکے متقاضی امور بھی تو پیدا کرنے ہمارے لئے ازبس ضروری ہیں۔ اسمائے الٰہیہ کا جو یہ نظام ہے وہ نہایت قابل غور ہے اور ہر قدم میں ہمارا خضر راہ ہونا چاہئے۔ اب اگر ان سارے کے سارے اسماء حسنہ پر غور کرنا اور انکے حسب حال اپنا حال کرنا ذکر و فکر کی نشانی ہے تو پھر وہ انسان یا وہ سوسائٹی جو خدا کے کسی خلق کے مناسب حال کوئی امر کرتی ہے اور دوسرے اخلاق الٰہیہ سے لاپرواہ ہو جاتی ہے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی ۔

یہ مضمون نہایت ہی دلچسپ ہے اور دل چاہتا ہے کہ ربانی اخلاق کی روشنی میں ایک کتاب لکھی جائے جو نہ صرف اپنی قوم کی ہدایت کا موجب ہو بلکہ وہ اس قابل ہو سکتی ہے کہ دنیا جہان کے تمدن و اخلاق پر لکھنے والے غیر مسلم مصنفین کی قلمیں توڑ کر انہیں قرآن کی حلقہ بگوش بنا دے۔ مغربی دنیا کو مسلمان کرنے کی ایک یہ راہ بھی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ المستعان ۔